اِن اُرِیدُ اِلّا الاِصلاحَ مَا استَطَعتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مئی ۲۰۱۳ء

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۳ء/ رجب ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○فکر و نظر

انتخابات ۲۰۱۳ء۔ دروس وعبر | مدیر | ۲
دینی سیاسی جماعتوں کی شکست واصلاح پر ایک فکری بحث
جماعت اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات

○تعلیم و تربیت

سکول کی تلاش | عزیز احمد مرزا | ۱۴
علمی و تعلیمی انحطاط | عبدالرشید ارشد | ۲۳

○تفہیم دین

مغرب زدہ اسلام۔ عمار ناصر اور مفتی ابولبابہ میں مباحثہ | مدیر | ۲۶
خدمتِ خلق۔ قرآن وسنت کی تعلیمات | جلال الدین عمری | ۳۰
قلب سلیم کیا ہے؟ | فتح اللہ گولن | ۳۷

○حالات حاضرہ: انتخابات ۲۰۱۳ء

نفاذ اسلام کے دشمن | پروفیسر طارق بٹ | ۳۸
اسلامسٹوں کے مفاداتی گروہ | پروفیسر ملک محمد حسین | ۴۱

○اسلام، سائنس و ٹیکنالوجی

جدید سائنس کے ناقدانہ مطالعہ کی ضرورت | سید خالد جامعی | ۴۳

○تزکیۂ نفس

توکل کرنا سیکھیے | احمد جاوید | ۴۹

○تبصرہ کتب

فرقہ واریت اور انتہا پسندی کے رجحانات | مدیر | ۵۳
از پروفیسر عبدالخالق سہریانی بلوچ

فکر و نظر **مدیر**

انتخابات ۲۰۱۳ء۔ دروس و عبر

مئی ۲۰۱۳ء میں پاکستان میں انتخابات ہوئے۔ حسبِ توقع مسلم لیگ (ن) جیت گئی، تحریک انصاف اور پیپلز پارٹی کو نسبتاً کم اور دینی سیاسی جماعتوں کو بہت ہی کم نشستیں ملیں۔ عملی لحاظ سے ہم ان انتخابات سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ اسلامی تناظر میں سوچنے کا یہ ایک پہلو ہے۔ اور کچھ سوالات فکری نوعیت کے ہیں جنہیں ہم بعد میں زیر بحث لائیں گے۔

بعض عملی پہلو

۱۔ امریکی غلامی

ایک بات بالکل واضح ہے کہ انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ (یا بین الاقوامی چودہری) پاکستان میں کوئی حقیقی اور بڑی تبدیلی نہیں چاہتے اور حقیقی اسلامی تبدیلی تو بالکل نہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے بھی Status quo یعنی صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ورنہ اگر ہماری قوم اور سیاسی جماعتوں میں حمیت ہوتی تو انتخابات کا سب سے بڑا ایجنڈا اور موضوع ''امریکی غلامی سے نجات'' ہوتا لیکن ''خفیہ ہاتھ'' نے یہ موضوع چھیڑنے ہی نہیں دیا اور خاموشی سے ایک ایسی سیاسی جماعت برسر اقتدار آگئی جو پرویز مشرف اور زرداری صاحب کی امریکہ و مغرب نواز پالیسیاں جاری رکھے گی (انیس بیس کے فرق کے ساتھ)۔ ظاہر ہے امریکہ بہادر جب قلعہ خالی کر رہا ہے تو پاکستان میں ایک 'ہم خیال' برسر اقتدار پارٹی، بلکہ ایک تازہ دم گھوڑا اس کی ضرورت ہے اور اس کے برعکس اور کچھ وہ افورڈ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لہذا تحریک انصاف، جماعت اسلامی، متحدہ دینی محاذ اور ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی شکست بہت ضروری تھی۔ اس بات کا اندازہ ان انتخابات سے پہلے ہی لگایا جا سکتا تھا چنانچہ ہم نے 'البرہان' کے پچھلے ماہ کے شمارے میں عرض بھی کر دیا تھا۔

۲۔ تبدیلی کا بند راستہ

ان انتخابات میں محنت، شہرت اور تحرک کے باوجود تبدیلی کے علم بردار عمران خان (تحریک انصاف) کی ناکامی نے ثابت کر دیا کہ پاکستانی سیاست میں انتخابات کے نتائج انجینئرڈ ہوتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کو ہرا کر اوپر آنا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ ہم اپنے اس موقف کو دہراتے ہیں کہ

امریکہ اور مغرب پاکستان میں کوئی حقیقی تعمیری تبدیلی نہیں چاہتے چنانچہ یہاں جمہوری سسٹم عمداً ایسا بنایا گیا ہے (دولت، برادری، جاگیرداری، کم شرح تعلیم، متوسط طبقے کو غیر موثر رکھنا، اہلیت کی اسلامی دفعات پر عمل نہ ہونے دینا۔۔۔غرض بیسیوں ایسے حیلے اور طریقے ہیں) کہ انہیں توڑ کر اور روند کر کوئی اوپر نہیں آ سکتا الّا یہ کہ بین الاقوامی اور مقامی اسٹیبلشمنٹ سے اندرخانے مفاہمت ہو۔ دینی عناصر کو مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنانے اور الیکشن لڑنے کی اجازت دینا اور انہیں باہم لڑانے اور متحد نہ ہونے دینے کا بھی بخوبی انتظام ہوتا ہے لہذا وہ صرف گنتی کی چند نشستیں ہی لے سکتی ہیں تاکہ وہ سیاست سیاست کھیلتی رہیں لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔

۳۔ عدلیہ کا سیکولر کردار

ضیاء الحق مرحوم نے آئین کی دفعات ۶۳، ۶۲ کا جو کانٹا سیاست کے سمندر میں ڈال دیا تھا، اس سے بچنے کا اسٹیبلشمنٹ ہمیشہ انتظام رکھتی ہے۔ اس دفعہ حکمرانوں کی کرپشن اور ملک لوٹنے کی انتہا ہونے اور سول سوسائٹی، میڈیا اور سیاسی جماعتوں کے بعض شرفاء نے ۶۳، ۶۲ کے کانٹے میں ''گنڈوئے'' لگا دیئے لیکن خیر سے ہماری سیکولر عدلیہ اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے لیے آ گئی اور وہی ''دستی صاحب'' جو ایک دن نااہل ہو کر رو رہے تھے اور جیل میں تھے، دوسرے دن ''پوتر'' ہو کر باہر آ گئے کیونکہ ریٹرننگ افسروں سے چیف جسٹس صاحب کا خطاب کروا دیا گیا اور ان کو لائن دے دی گئی اور دستی صاحب اور ان جیسے دوسرے جعلی ڈگری والوں، نادہندہ، قرض خوروں اور کرپٹ لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ ان میں سے بہت سے انتخابات جیت گئے ہیں اور اب برسر اقتدار آ کر قوم کا مال کھائیں گے اور اس کا خون پئیں گے۔ جمہوریت زندہ باد۔

انتخابات کے عملی پہلوؤں پر اس مختصر تبصرے کے بعد اب ہم اس حوالے سے کہ دینی قوتوں کی شکست کے اسباب کیا ہیں، غلطیوں سے سبق کیسے سیکھا جائے اور اس معاشرے کو اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل کیا ہو؟ ہم بعض فکری نکات اٹھانا چاہتے ہیں۔ اللہ کرے کچھ پڑھے لکھے لوگ ان پر غور فرما سکیں۔

بعض فکری پہلو

۱۔ پاکستان کی سیکولر سیاست

ایک طرف ہماری سوچ اور خواہش ہے (بلکہ ممکن ہے بعض لوگ اسے Wishful thinking بھی

کہیں) کہ پاکستانی معاشرے اور ریاست کی بقاء، استحکام اور ترقی کا انحصار ہماری اسلام سے وابستگی پر ہے اور دوسری طرف امرِ واقعی اور زمینی حقائق ہیں۔ جو نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانی سیاست سیکولر ہو چکی ہے بلکہ ویسٹرنائز (Westernize) اور امیریکنائز (Americanize) ہو چکی ہے۔ ہمارے حکمران، خواہ فوجی ہوں (پرویز مشرف جیسے) یا سِول (زرداری اور نواز شریف جیسے) ان کے سامنے جو مسائل ہیں وہ ہیں غربت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، کرپشن اور دہشت گردی یا ان کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ امریکی اور یورپی مفادات (خواہ ان کا ہدف اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنا ہی کیوں نہ ہو) کا تحفظ ۹۵ فیصد کیا جائے یا ۹۹ فیصد۔ ''پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے'' یہ اب ہماری سیاست کا مسئلہ نہیں رہا۔ یہ نہ پرویز مشرف کا مسئلہ تھا، نہ زرداری کا اور نہ اب نواز شریف کا ہوگا۔ یہ اب Non issue ہے۔ امرِ واقعی یہی ہے، خواہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند۔

ہم جب کہتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے اور ریاست کی بقاء، استحکام اور ترقی کا انحصار اسلام سے ہماری وابستگی پر ہے تو ہم کوئی سطحی، عامیانہ یا مولویانہ بات نہیں کہتے بلکہ یہ بات قرآن وسنت پر مبنی ہے، دانش کے ہر معیار پر پورا اترتی ہے اور نہایت سائنٹفک اور منطقی ہے۔ قرآن وسنت سے قوموں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کا جو فلسفہ یا کلیہ ہماری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوم جن نظریات کو مانتی ہے اگر وہ ان پر گہرا اور پختہ یقین رکھے، ان سے سچی وابستگی رکھے، اس کے تقاضوں پر عمل کرے تو اس کے اندر وہ انسانی صلاحیتیں ابھر آتی ہیں جو دنیا میں ترقی وتقدم کے لیے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت، قانون کی اطاعت، نظم وضبط، منصوبہ بندی، ایثار وقربانی، اطاعت امیر۔۔۔وغیرہ اور جس قوم کے افراد میں یہ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ دنیا میں ترقی وتقدم کے راستے پر چل پڑتی ہے اور سیادت کی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ جن نظریات پر یہ قوم یقین رکھتی ہے اگر وہ صرف اِس دنیا سے بحث کرتے ہوں تو وہ اس دنیا میں کامیابی پاتی ہے اور اگر دنیا کے ساتھ آخرت میں بھی یقین رکھتی ہو تو دونوں میں کامیابی کی راہ اس پر کھل جاتی ہے لیکن وہ قوم جو ایک طرح کے نظریات پر ایمان لانے کا دعویٰ کرے لیکن اس کے دل ودماغ کسی دوسرے دین یا تہذیب کے نظریات پر ریجھے ہوئے ہوں اور ان کا عمل، ان کے قول کے برعکس، اس دوسری تہذیب پر مبنی ہو تو ایسی منافق قوم کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی۔

اسی لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ دین سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، محض جمہوریت کے ذریعے معاشرے میں ایسی بڑی تبدیلی اور انقلاب لے آئیں گے جس سے پاکستانی معاشرہ مستحکم ہو جائے گا اور ترقی کرے گا ہمارے نزدیک وہ یا تو جاہل، بے عقل اور سادہ لوح ہیں یا عیار ومنافق اور دھوکہ باز۔

۲۔ علماء کا حریفانہ سیاسی کردار

صدرِ اوّل میں حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی مظلومانہ اور سفاکانہ شہادت اور اس پر حکمران سیاسی طبقات کے ردِعمل نے اہلِ علم وصلاح کو مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں سمٹنے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے نظام کو چیلنج کرنے کی بجائے نظام کے اندر رہ کر اور حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش میں پڑے بغیر حکمرانوں کی پرامن اصلاح کا اسلوب اپنالیا اور سماجی سطح پر تعلیم وتربیت (مدارس و خانقاہیں)، عدلیہ (قضاء)، قانون سازی (فقہ وافتاء) اور معاشرتی رسوم ورواج (نکاح وطلاق وغیرہ) کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر معاشرے اور ریاست کو اسلام سے دور نہ ہونے دیا۔ مسلم امہ کے زوال کے نتیجے میں مغرب کی غزوِ فکری، سازشوں اور فوجی قوت نے ۱۹۲۴ء میں مسلمانوں کا خلافت کا برا بھلا سیاسی نظام بھی توڑ دیا اور زوال سے نکلنے اور استعمار اور استعمار کے مقامی ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جو نئی دینی تحریکیں اٹھیں (شرق اوسط میں الاخوان المسلمون اور جنوب مشرقی ایشیا میں جماعت اسلامی وغیرہ) انہوں نے ماضی کے اس اجتہاد کو کہ ''نظام کو چیلنج نہ کیا جائے اور حکام سے حریفانہ کشمکش نہ کی جائے بلکہ نظام کے اندر رہ کر پرامن طریقے سے حکومتوں کی اصلاح کی جائے'' کو چھوڑ کر نیا اجتہاد کیا اور مسلم حکمرانوں کے خلاف حریفانہ سیاسی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ان کے نزدیک اس نئے اجتہاد کا جواز یہ تھا کہ مسلمانوں کا وہ سیاسی نظام (خلافت) باقی نہیں رہا تو اب کس نظام کی حفاظت کے لیے وہ سابقہ رویہ اپنایا جائے جو مسلمان اہلِ علم وصلاح صدیوں اپنائے رہے جب کہ وہ نظام (خلافت) ویسے بھی کرپٹ اور ڈی ریل ہو چکا تھا اور خلافت ملوکیت میں بدل چکی تھی لہذا اس کے اعادے اور بحالی کی کوشش بھی فضول تھی۔ یوں تازہ اجتہاد روبہ عمل آ گیا اور پچھلی تقریباً ایک صدی سے روبہ عمل ہے لیکن اس کے مثبت نتائج نہیں نکلے اور دینی قوتیں کہیں بھی اقتدار میں آ کر مسلم معاشرے کی رفعت وسربلندی، اسلام سے اس کے تمسک اور مسلم ممالک کے استحکام میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔*

---

* ایران کا اسلامی انقلاب ایک استثناء ہے اور اس کی بنیادی وجہ اہلِ تشیع کا مخصوص مائنڈ سیٹ ہے جو عالم اسلام کی ۹۰ فیصد اہل سنت آبادی میں موجود نہیں۔ ترکی اور ملائشیا کا تجربہ عارضی، غیر نمائندہ اور ناقص ہے، بایں معنی کہ وہ مغربی تہذیب کی اسلام اور مسلم دشمنی سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے، اسلام اور مغربی تہذیب میں مفاہمت اور چند بنیادی انسانی اوصاف (گڈ گورننس، اچھی معاشی پالیسیوں وغیرہ) پر مبنی ہے۔ مصر اور تیونس وغیرہ میں جو بظاہر خوش آئند تبدیلیاں حال ہی میں ابھری ہیں وہ طویل آمریت کے ردِعمل کا نتیجہ ہیں اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہاں بھی دینی قوتیں جمہوریت کو اپنانے کے نتیجے میں بتدریج اسی طرح ناکام ہوں گی جس طرح انڈونیشیا میں ماسومی، پاکستان میں جماعت اسلامی اور دیگر جگہوں پر مقامی اسلامی جمہوری قوتیں ناکام ہوئی ہیں۔

اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم مفکرین اور مصلحین کو دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اس اجتہاد پر نظر ثانی کرنی چاہیے جو ایک صدی پہلے کیا گیا تھا اور جس کی رُو سے علماء نے مسلم حکمرانوں کے بالمقابل حریفانہ سیاسی کردار ادا کرنا شروع کیا تھا اور دنیادار مسلم حکمرانوں کے مقابلے میں وہ خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آ گئے تھے۔ اور ہم متنبہ کر دیں کہ یہ اجتہاد اسی وقت باوزن اور امت کے لیے قابل قبول ہوگا جب ایسے مجتہدین و مفکرین اسے انجام دیں جو تقوی اور دینی علوم میں رسوخ کے ساتھ فکری استقلال رکھتے ہوں۔ سعودی علماء، امریکی و یورپی علماء، جاوید غامدی صاحب، تقی عثمانی صاحب، یوسف القرضاوی صاحب یا کسی درجے میں پروفیسر خورشید صاحب اور نجات اللہ صدیقی صاحب جیسے لوگ جن پر پہلے سے یہ اعتراض موجود ہے کہ وہ مغربی فکر و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہیں، ان پر امت اس سلسلے میں اعتماد نہیں کرے گی۔

۳۔ جمہوریت کا نتیجہ مغربیت و بے دینی

مسلم معاشرے میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ہمارے روایتی، تحریکی اور جدید علماء سب نے یہ اجتہاد کیا کہ مغربی جمہوریت میں کچھ بنیادی اسلامی اصول شامل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور ریاست کے آئین و قوانین کو مزید اسلامی بنانے کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ پاکستان میں اس کا تجربہ پچھلے ٦٦ سال سے جاری ہے اور اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ ہماری رائے میں اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے، جس کا مشاہدہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے اللہ نے بصیرت و بصارت سے محروم نہیں رکھا، کہ مغربی تہذیب کے اصول و اقدار ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں، سیاست میں، تعلیم میں، قانون میں، معیشت میں، معاشرت میں، عدالتوں میں، میڈیا میں غرض ہر شعبۂ زندگی پر غالب آ گئے ہیں اور اسلامی اصول و اقدار ان شعبوں سے پسپا ہو گئے ہیں اور پاکستانی معاشرہ اخلاقی طور پر تباہ اور واضح طور پر دین سے دور ہو گیا ہے۔

اصل میں پہلے ہی یہ ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ مغرب کی ملحدانہ اور اسلام مخالف فکر و تہذیب پر مبنی اور اس کے وضع کردہ سیاسی نظام (جمہوریت) میں چند اسلامی کلیوں کی پیوند کاری سے وہ اسلامی نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا سیکولر اور کافرانہ مزاج خود بخود اسلامی ہو جاتا ہے اور نہ وہ اسلامی نتائج دے سکتا ہے بلکہ مغربی جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے اسے صرف ایک مجبوری سمجھ کر، عارضی طور پر قبول کرنا چاہیے تھا اور ساتھ ہی پورا زور معاشرے کی اسلامائزیشن پر لگا دینا چاہیے تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ مسلم معاشرے اُس وقت مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک کے دباؤ میں تھے۔ اکثر مسلم ممالک کے حکمران

مغرب کے لے پالک اور ایجنٹ تھے، بیوروکریسی اور فوج ان کی تربیت یافتہ تھی۔ نظام تعلیم، قانون، معیشت، عدالتیں، اسمبلیاں سب مغربی اصولوں پر مبنی تھیں لہٰذا مسلم معاشرے میں اسلامی اصولوں کی ترغیب، اشاعت اور تنفید کی مساعی بھرپور انداز میں جاری رکھی جاتیں اور اسلامی جمہوری نظام کو بامر مجبوری قبول کیا جاتا اور جونہی کچھ قوت حاصل ہوتی تو اسلام کے سیاسی اصولوں کی بنیاد پر نئے سیاسی ادارے بنائے جاتے اور اسلامی جمہوریت کے مجبوری کے عارضی نظام کو منہدم کردیا جاتا۔

یہ بات کہ جمہوریت (خواہ وہ خالص مغربی ہو یا برائے نام اسلامی) کا لازمی نتیجہ سیکولرزم، مغرب پرستی اور بے دینی ہوگا، اگر پہلے نہیں سوچی گئی تو اب سوچ لی جائے، سابقہ اجتہاد پر نظر ثانی کی جائے اور نیا اجتہاد کرکے اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے۔

اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ جمہوریت تو ایک سیاسی نظام ہے۔* جیسے لوگ ہوں گے ویسے ہی وہ اپنے حکمران چن لیں گے۔ لوگوں کو بدلنا، ان کے دل ودماغ کو بدلنا، انہیں اچھا، یکسو اور باعمل مسلمان بنانا یہ جمہوریت کا دائرہ کار ہی نہیں۔ اگرچہ موجودہ حالات میں یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ پاکستان کی کوئی دینی سیاسی جماعت یا ان کا کوئی اتحاد جمہوریت کے ذریعے انتخابات جیت کر برسر اقتدار آجائے ـــــ لیکن بفرضِ محال اگر ایسا ہو بھی جائے تو وہ اتحاد یا جماعت کیا کرلے گی؟ زیادہ سے زیادہ قانون اسلامی بنالے گی لیکن قانون دل ودماغ کو تو نہیں بدلتا، وہ تو صرف قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ آپ کے قوانین آج بھی اکثر اسلامی ہیں۔ آپ کے دستور میں اسلامی دفعات بکثرت موجود ہیں، حدود قوانین موجود ہیں، زکوٰۃ، عشر، احترام رمضان، حج، نماز کے لیے قوانین موجود ہیں تو قانونی ڈھانچہ تو آپ کا بڑی حد تک پہلے ہی اسلامی ہے۔ تو کیا معاشرہ اسلامی ہوگیا ہے؟ نہیں ہوا! تو اگر آپ نے حکومت میں آکر بھی لوگوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لیے ان کے دل ودماغ کو بدلنا ہے تو یہ کام آپ ابھی کیوں نہیں کرتے؟ کس نے آپ کا ہاتھ پکڑا رکھا ہے؟ یاد رکھیے! آج تک دنیا میں جمہوریت یعنی اکثریت کی مرضی اور حمایت سے کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے انقلاب آئے ہیں وہ ہمیشہ فرد لاتا ہے، اقلیت لاتی ہے اور قرآن اٹھا کر دیکھ لیجیے یہی منہجِ انبیاء ہے۔

---

*اگرچہ بعض لوگ اسے کافرانہ نظام حیات بھی کہتے ہیں جس میں اگرچہ تھوڑا سا مبالغہ موجود ہے لیکن اصلاً یہ بات غلط بھی نہیں کیونکہ مغربی جمہوریت کا نہ صرف مزاج کافرانہ ہے بلکہ یہ غلبۂ کفر کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور آلہ (Tool) بھی ہے۔

۴۔ عوام قابل اصلاح یا قوت کا سر چشمہ

مغرب کی جمہوریت کے جو برے اثرات ہمارے معاشرے اور سیاست پر پڑے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مغرب میں چونکہ فرد اپنا خدا خود ہے، وہ خودمختار بلکہ مختار مطلق ہے لہذا اس کے جو نمائندے پارلیمنٹ میں جاتے ہیں وہ بھی خودمختار اور مختار مطلق ہوتے ہیں۔ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دے سکتے ہیں اور جس چیز کو چاہیں حرام۔ وہاں کے عوام طاقت کا منبع ہوتے ہیں اور بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے ہیومنزم کے تصورات کے عین مطابق ہے کیونکہ مغرب کا تصور انسان یہ ہے کہ انسان کسی خدا کا عبد اور بندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ مادر پدر آزاد ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے کہ زندگی جیسے چاہے گزارے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی معاشرے میں انسان اللہ کا عبد ہوتا ہے اور ان میں بہتر وہ ہوتا ہے جو متقی ہو، اللہ کے احکام پر دوسروں سے بہتر عمل کرنے والا ہو۔ ایسے لوگ عموماً اقلیت میں ہوتے ہیں [۱] اور قرآن حکیم کی بے شمار آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ لوگوں کی اکثریت احکام خدا کی نافرمانی کرنے والی اور قابل اصلاح ہوتی ہے [۲] اور یہ علماء وصلحاء کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ عام لوگوں کی اصلاح کے لیے کوششیں کرتے رہیں۔ [۳]

ہمارے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ علماء وصلحا کا عوام الناس اور اکثریت کے ساتھ رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ اس حوالے سے اسلام اور مغرب کے نقطۂ نظر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ اسلام بلاشبہ سیاسی امور میں سب سے مشاورت کا حکم دیتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا طرز عمل یہی ہے کہ مسلم معاشرے میں قیادت وسیادت انہی کا حق ہے جو قوی وامین ہوں، عالم اور متقی ہوں، جو فہم وفراست اور عقل و دانش میں دوسروں سے ممتاز ہوں نہ کہ عوام کالانعام کا۔ دینی سیاسی جماعتیں اور ان کے کارکن اس تضاد سے نکل نہیں پائے۔ انہیں اصلاً عوام کی اصلاح کرنی چاہیے، ان کو دین دینا چاہیے لیکن جمہوریت کی وجہ سے وہ انتخابات میں ان سے ووٹ مانگنے پہنچ جاتے ہیں۔ گویا وہ عوام کو کچھ دینے والے نہیں ان سے کچھ لینے والے بن جاتے ہیں اور اقبال کے بقول ؎ مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج

۱۔ السبا ۳۴: ۱۳، ھود ۱۱: ۴۰، ص ۳۸: ۲۴

۲۔ الاعراف ۷: ۱۰۲، یونس ۱۰: ۶۰، یوسف ۱۲: ۱۰۶، النحل ۱۶: ۸۳

۳۔ التوبہ ۹:۱۷، ۱۲۲، آل عمران ۳:۱۰۴، ۱۱۴

۵۔مغرب کی پلاننگ کا توڑ نہ کر سکنا

ہم نے اپنی کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ' میں یہ بات وضاحت سے لکھی ہے کہ اسلامی اصولوں پر مبنی تہذیب اس وقت شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے جب اس کے پیروکار اس کی تعلیمات پر عمل چھوڑ دیں اور غیر اسلام پر مبنی تہذیب اس وقت ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہے جب وہ اپنے فاسد اصولوں کی وجہ سے داخلی تضادات کا شکار ہو جاتی ہے اور فساد فی الارض کا موجب بنتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور مشیت کی وجہ سے مغربی تہذیب کے علم بردار ممالک دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں باہم لڑ کر کمزور ہو گئے اور ان مسلم ممالک کو بظاہر ''آزادی'' دینے پر مجبور ہو گئے جنہیں انہوں نے غلام بنا رکھا تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ 'آزادی' برائے نام تھی اور یہ اصل میں غلامی ہی تھی۔فرق صرف یہ واقع ہوا کہ استعمار نے اب چولا بدل لیا۔آج بھی امریکہ و یورپ ''گلوبلائزیشن'' کے نام پر، ''جمہوریت'' کے نام پر، معاشی خوشحالی کے نام پر، (ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے ذریعے) آزادی، مساوات اور تعلیم کے نام پر مسلم ممالک میں بھرپور مداخلت کر رہے ہیں، ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ شروع ہی سے انہوں نے پلاننگ کی اور اقتدار منتقل ہی اپنے لے پالکوں اور اپنے تربیت یافتہ سیاستدانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو کیا۔اپنی تربیت یافتہ بیوروکریسی، فوج اور ججوں کو بااختیار بنوایا اور بادشاہ گر کا کردار ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ہمارے فوجی حکمران بھی ان کی اشیرباد سے آتے ہیں اور سول بھی*۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے دینی سیاسی عناصر نے مغرب کی اس منصوبہ بندی کو ناکام بنانے کے لیے کیا پلاننگ کی؟ معاف کیجیے گا! ہمارے علماء کی یہ حالت ہے کہ انگریزی پڑھنے اور دینی مدارس میں مغربی فکر و تہذیب کا مطالعہ کرنے کا کوئی تصور ہی سرے سے موجود نہیں۔جدید تعلیمی، علمی اور تحقیقی اداروں میں بھی مطالعۂ مغرب کا کوئی چلن نہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اور دانشوروں کی اکثریت مغربی فکر و تہذیب کو سمجھتی ہی نہیں، اسے علمی سطح پر رد کرنے یا اس کے پیدا کردہ چیلنج کا جواب دینا تو دور کی بات ہے۔اور اس سے بڑھ کر مقام عبرت یہ ہے کہ اسلامی جماعتوں کے ''اسلامی انقلاب زندہ باد'' کے نعرہ لگانے والے کارکن اپنے تعلیمی اداروں میں مغربی فکر و تہذیب اور اس کے لائف سٹائل کو پروموٹ کر رہے ہیں، چہ جائیکہ وہ معاشرے کو اس ملحدانہ تہذیب کے چنگل سے نکالتے، وہ خود اس سیلاب میں بہے چلے جا رہے

*اور جب اتنی پابندیوں کے باوجود کچھ مسلم ممالک نے سر اٹھانا شروع کیا تو امریکہ و یورپ ننگی جارحیت پر اتر آئے۔ پہلے

انہوں نے عراق کو تباہ و برباد کیا، پھر افغانستان کا تورا بورا بنایا۔ پاکستان، یمن اور صومالیہ پر حملے جاری ہیں اور ایران و شام کا گھیراؤ بھی جاری ہے۔

ہیں بلکہ دوسروں کو بھی کھینچ کر اس میں لا رہے ہیں ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
تو اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں اخلاقی انحطاط، مغرب پرستی اور بے دینی زوروں پر ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟

۶۔تبدیلی کا منہج۔دعوت و اصلاح

قرآن حکیم نے بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ انبیاء کا تبدیلی لانے کا منہج ''**یعلمهم الكتاب والحكمه ویزكیهم**'' تھا۔ یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس۔ اسے مزید مختصر کریں تو دعوت و اصلاح یا آج کی اصطلاح میں تعلیم وتربیت کہہ سکتے ہیں اور اس تبدیلی کے داعی ہمیشہ اقلیت میں ہوتے تھے اور معاشرے کے کمزور اور پسے ہوئے طبقات کے لوگ ہوتے تھے۔ یہ اپنی قوم اور معاشرے کو بدلنے کی سرتوڑ جدوجہد کرتے تھے اور یہی جدوجہد منہاج فوز وفلاح تھی۔ تاریخ میں کم ہی ایسا ہوا ہے کہ یہ اقلیت اکثریت میں بدل گئی ہو۔ اور قرآن وسنت میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ کسی پیغمبر نے اکثریت کی مرضی ومنشا اور حمایت سے معاشرے کو اسلام کی راہ پر ڈالا ہو۔ اس لیے ہم ان لوگوں کا موقف سمجھنے سے قاصر ہیں جو دعوت واصلاح کے کام کو تو بنیادی اہمیت نہیں دیتے اور اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ وہ جمہوریت کے ذریعے یعنی جمہور کی حمایت وتعاون سے اسلامی انقلاب لائیں گے۔

معاشرے میں اسلامی تبدیلی لانے کا نبوی منہاج اور فطری طریقہ یہی ہے کہ افراد معاشرہ تک دین پہنچایا جائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی جائے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے۔ اس طرح یہ تبدیلی فرد سے شروع ہو کر بتدریج معاشرے تک پھیلتی چلی جائے گی کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے ذریعے برسر اقتدار آ کر لوگوں کی اصلاح کریں گے اور انہیں دین دار بنا دیں گے، وہ نہایت بے عقلی کی بات کہتے ہیں اور گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور منہج انبیاء کے بھی خلاف ہے اور خلاف فطرت اور خلاف عقل ودانش بھی ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے، نہ کبھی ہوگا۔ آخر لوگ انہیں کیوں ووٹ دیں گے جب وہ دین دار نہیں ہیں اور دین پر عامل نہیں ہیں؟ اور اگر لوگ دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ نہیں دیتے

توضرورت انہیں دین دار بنانے کی ہے تا کہ وہ انہیں ووٹ دیں نہ کہ انتخابات جیتنے کے مغربی طریقوں پر عمل کی۔

یہ ایک بنیادی بات ہے کہ تہذیب، معاشرے اور ریاست کی بنیاد فرد ہے اور فرد کو بدلے بغیر اجتماعیت میں کسی سطح پر بھی تبدیلی نہیں آسکتی۔ لہذا بنیادی ضرورت فرد کو بدلنا ہے اور یہ سیڑھی نیچے سے اوپر کو جاتی ہے یعنی اقرب فالاقرب کی ترتیب کے ساتھ یعنی پہلے فرد، پھر گھر، پھر خاندان، پھر گلی محلہ، پھر شہر، اور پھر معاشرہ وریاست اور یہ اوپر سے نیچے کو نہیں آتی۔

قرآن حکیم، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ صحابہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طاقت کا منبع فرد کی ایمانی و اخلاقی حالت ہے نہ کہ مادی وسائل۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اقتدار کے نصف اوّل کا عرصہ پندرہ سال سے کم بنتا ہے۔ اِس عرصے میں اُس وقت کی دو سپر پاورز کو مسلمانوں نے شکست دے دی۔ کیا انہوں نے ایٹم بم برسائے تھے؟ نہیں! ان کے پاس پچکے ہوئے پیٹوں والے گھوڑے اور ٹوٹی ہوئی تلواریں تھیں۔ تو پھر ان کی طاقت کا راز کیا تھا؟ ایمان اور اخلاق نہ کہ تعداد اور ہتھیار۔ جب تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی ہم جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب کی ناکام جدوجہد کرتے رہیں گے۔

خلاصۂ بحث

۱۔ پاکستانی سیاست سیکولر ہوگئی ہے، دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہوگئی ہیں اور مستقبل میں بھی اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ موجودہ جمہوریت کے ذریعے برسر اقتدار آئیں گی اور آکر اسلامی شریعت نافذ کرسکیں گی۔

۲۔ بظاہر ایک حل یہ نظر آتا ہے کہ اگر دینی سیاسی جماعتیں نفاذ اسلام کے کسی پروگرام پر متحد ہوجائیں تو وہ کامیاب ہوسکتی ہیں لیکن اس کا بھی عملاً کوئی امکان نہیں کیونکہ اکثر دینی سیاسی جماعتیں اپنے اپنے فقہی اور کلامی مسلک پر کھڑی ہیں، وہ نہ دوسرے مسلک والوں سے اتحاد کرتی ہیں اور نہ انہیں ان کے ووٹ مل سکتے ہیں۔ کئی لوگوں کو محض اقتدار، کرسی اور اپنی لیڈری سے غرض ہے اسلام نافذ ہو نہ ہو ان کی بلا سے۔ ان دینی سیاسی جماعتوں کی قیادت کی اصلاح کرنے والی مؤثر مشینری بھی موجود نہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کے انتشار وافتراق اور شکست میں انٹرنیشنل ومقامی اسٹیبلشمنٹ اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کا بھی بڑا کردار ہے لیکن ان کا توڑ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

۳۔ پاکستانی معاشرے کا اسلامی مستقبل خطرے میں ہے اور جمہوریت وسیاست میں اس بیماری کا علاج

موجود نہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں، غیر سیاسی شعبوں (خصوصاً دینی مدارس اور مساجد) میں کام کرنے والے غیر سیاسی علماء کرام اور سول سوسائٹی کے دین دار افراد سب کا فرض ہے کہ وہ منہج پیغمبر یعنی تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ کو بنیاد بنا کر عصر حاضر اور موجودہ حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اصلاح و خدمت کی ایک منظم تحریک شروع کریں۔ جدید و دینی تعلیم اور میڈیا کی اصلاح کر کے لوگوں کی ایمان افروزی، ذہن سازی اور فکری تطہیر کریں۔ دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو رواج دے کر لوگوں کے اخلاق درست کریں اور خدمت خلق کو شعار بنائیں تا کہ لوگوں کے دکھ درد کم ہوں اور وہ سکون کا سانس لے سکیں۔ **هذا من عندنا و العلم عند الله۔**

جماعت اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات وتجاویز

پاکستان کے حالیہ انتخابات میں دینی سیاسی جماعتوں کی شکست کے اسباب کا جو تجزیہ ہم نے سطور بالا میں کیا ہے اور اس کا جو حل پیش کیا ہے، اس کا اطلاق جماعت اسلامی پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم جماعت اسلامی اس حوالے سے دوسری دینی سیاسی جماعتوں سے کچھ مختلف بھی ہے کہ اس کی بنیاد فرقہ وارایت پر نہیں اور روایتی دینی جماعتوں کے مقابلے میں جدید تعلیم یافتہ طبقات میں اس کا کام بھی زیادہ اور موثر ہے۔ اس لیے چند گزارشات وتجاویز ہم اس جماعت کی خدمت میں بھی پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی کی شکست سے ہمیں صدمہ پہنچا ہے۔ اس لیے **الدین النصیحه** اور جماعت سے ہمدردی وخیر خواہی کا تقاضا ہے کہ جماعت کے کام کو بہتر بنانے اور اسے مستقبل میں کامیاب دیکھنے کے لیے جو تجاویز ہماری سمجھ میں آتی ہیں وہ دردِ دل اور جذبۂ اخلاص سے ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ امید ہے وہ ان پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے:

۱۔ جماعت حسب سابق ان انتخابات میں بھی کامیاب نہیں ہوسکی۔ اس پر قائدین کے بیانات اور شوری کی قرارداد کافی نہیں ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ جماعت کے اپنے جرائد (ترجمان القرآن، ایشیا وغیرہ) میں ارکان و ہمدردان جماعت کو اس موضوع پر کھل کر اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔ اس سے لوگوں کی تحلیل نفسی ہوگی، اچھی تجاویز سامنے آئیں گی، لوگوں میں احساس شراکت ابھرے گا اور ان کی مایوسی میں بھی کمی ہوگی۔

۲۔ اس موضوع پر جماعت کے بانی مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کے افکار سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ فوری طور پر تین نکات ہماری لوح یادداشت پر ابھر رہے ہیں:

ا۔ مولانا مودودیؒ نے روداد جماعت اسلامی میں ایک جگہ کہا ہے کہ انتخابات کا نتیجہ ہمارے دعوتی کام کا

پیمانہ ہے یعنی اگر انتخابات کا نتیجہ اچھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کارکنوں نے دعوتی کام خوب کیا ہے۔ اسی طرح انتخابی نتیجہ کمزور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کارکنوں نے دعوتی کام پر توجہ نہیں دی۔

ب۔ مولانا مرحوم نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلامی حکومت فطری اور منطقی نتیجہ ہوتی ہے تحریک اسلامی کی ان کوششوں اور جدوجہد کا جو وہ اسلامی تناظر میں فرد اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کیے بغیر اسلامی حکومت قائم نہیں ہوسکتی اور اگر بفرض محال کسی طرح قائم ہو بھی جائے تو قائم رہ نہیں سکتی۔

ج۔ قیام پاکستان کے بعد جب جماعت نے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں تو مولانا نے ترجمان القرآن میں کسی صاحب کے سوال کے جواب میں لکھا کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے دو طریقے ممکن ہیں: ایک یہ کہ معاشرے کی جڑ بنیاد سے اصلاح کی جائے جس کے نتیجے میں منطقی طور پر اسلامی حکومت وجود میں آجائے اور دوسرے یہ کہ اس کے لیے براہ راست سیاسی جدوجہد کی جائے۔ اِس وقت ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے کیونکہ قوم نے تحریک پاکستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا ارادہ اور عہد کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہمیں اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی تو ہم واپس پہلے منہاج کی طرف لوٹ جائیں گے یعنی اصلاح فرد و معاشرہ کی جدوجہد کریں گے تا آنکہ اسلامی حکومت قائم ہوجائے۔ یہ بحث مولانا کی کتاب ''اسلامی ریاست'' کے آخری صفحات میں مطبوعہ موجود ہے۔

ان نکات کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ براہ راست ٦٦ سالہ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں جماعت اسلامی کو سیاسی کامیابی نہیں ملی اس لیے مولانا مودودیؒ کی فکر کے مطابق اسے اب براہ راست سیاسی جدوجہد ترک کرکے دعوت و اصلاح کے ذریعے اصلاح فرد و معاشرہ کے منہاج کی طرف لوٹ جانا چاہیے تاکہ اقامت دین کی منزل سر ہوسکے۔

۳۔ جماعت کو تقسیم کار کا اصول اپنانا چاہیے جیسا کہ مصر، ترکی وغیرہ میں کامیاب تجربات ہوچکے ہیں یعنی جماعت کا سارا ڈھانچہ تو دعوت و اصلاح کا کام کرے اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے ایک ''سیاسی جماعت'' بنادی جائے جو اس طرح جدوجہد کرے جس طرح کہ دوسری سیاسی جماعتیں کرتی ہیں۔

۴۔ جماعت اپنی ابتداء میں اعلیٰ اخلاقی ساکھ رکھتی تھی۔ اب بھی یہ اس حوالے سے دوسری سیاسی جماعتوں سے بہتر ہے لیکن طویل سیاسی جدوجہد اور دعوتی و اصلاحی کاموں پر عدم ترکیز کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پر خصوصی توجہ دی جائے اور ارکان و کارکنوں کے تقوی اور اخلاقی معیار کی بلندی کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں خصوصاً جماعت سے وابستہ جن حضرات کے تعلیمی، تجارتی و معاشرتی ادارے

مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کو فروغ دے رہے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی اور اصلاح کی جائے۔

البرہان اس ماہ کے 'فکر و نظر' پر تبصرہ و تنقید کا خیر مقدم کرے گا۔

تعلیم و تربیت

عزیز احمد مرزا *

سکول کی تلاش

گھر بچے کا پہلا اور بنیادی مدرسہ ہے۔ بچے کی پیدائش کے پہلے روز ہی اس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی تعلیم ماں کی گود، اپنے جھولے اور گھر کے آنگن میں مسلسل جاری رہتی ہے۔ اسی ماحول میں وہ بیٹھنا، فرش پر گھسٹنا، پھر کھڑے ہونا اور چلنا پھرنا سیکھتا ہے۔

- یہیں وہ بولنا سیکھتا ہے۔ اسی ماحول میں وہ نطق (Speech) جیسی کارآمد مہارت پر عبور حاصل کرتا ہے

- نطق کی اس مہارت سے وہ مادری زبان (Mother Tongue) سیکھتا ہے۔ زبان کی مثال بجلی کے تار کی سی ہے۔ جیسے دھاتی تار سے کرنٹ روشنی کے قمقموں اور گھر میں استعمال کی مشینوں تک پہنچتا ہے، قمقمے روشن ہو کر ماحول کو منور کرتے ہیں اور مشینیں آپ کے لیے بہت سی خدمات بجالاتی ہیں، ایسے ہی علم گھر کے ماحول اور گھر میں موجود شخصیات سے زبان کے واسطے سے بچے کو منتقل ہوتا ہے۔

- بچہ اسی مادری زبان میں اپنی حاجات اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، گھر والوں سے مکالمہ کرتا ہے اور اپنی کہتا اور اُن کی سنتا ہے۔

- اسی زبان کے ذریعے وہ بہت سی اشیاء، افراد، رشتوں اور افعال کے نام سیکھتا ہے اور نت نئی معلومات حاصل کرتا ہے۔

- بچہ حاصل ہونے والی معلومات کا محض سٹور ہاؤس بن کے نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوچتا ہے۔ اس کے ذہن میں سوالات جنم لیتے ہیں اور وہ ان کا جواب چاہتا ہے۔ اپنے تجسس کی تسکین کے لیے سوال پوچھتا ہے۔ ماحول سے حاصل ہونے والی معلومات اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں۔ وہ جن مہارتوں پر عبور حاصل کرتا ہے ان کی کارکردگی دکھاتا ہے، اپنی فتوحات پر مسرت کا اظہار کرتا ہے اور افرادِ خانہ میں خوشیاں بانٹتا ہے۔ یوں اس کی شخصیت کی تعمیر ہر آن ہوتی رہتی ہے اور اس تعمیر میں بڑا موثر کردار اس کی

* ڈائریکٹر ایمان سکول لاہور

مادری زبان کا ہوتا ہے۔

- گھر میں بچہ ماں کی الفت و محبت، باپ کی شفقت، دادا دادی، نانا نانی اور بہن بھائیوں کے پیار کی حلاوت اور رشتوں کی چاشنی سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ ہر بچہ گھر کے تمام افراد کی توجہ اور محبت کا مرکز ہوتا ہے اور اُن کے مشفقانہ سلوک سے اُسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

- گھر کے ماحول میں بچہ دن طلوع ہوتے دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ گھر کے افراد کچھ خاص سرگرمیوں میں لگ گئے ہیں۔ خود اسے ٹائلٹ لے جایا جاتا ہے یا اُسے وہاں جانے میں مدد دی جاتی ہے۔ اس کا منہ دھلایا جاتا ہے یا نہلایا جاتا ہے، لباس تبدیل کیا جاتا ہے اور ناشتہ کرایا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دھوپ اور روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ دوپہر ہوتی ہے۔ دن ڈھلتا ہے۔ شام ہوتی ہے۔ مختلف اوقات کے ساتھ مختلف سرگرمیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ پھر رات آتی ہے اور سب سو جاتے ہیں۔

- وہ موسموں کو بدلتے دیکھتا ہے۔ رُت بدلنے کے ساتھ لباس میں تبدیلی آتی ہے۔ گرمیوں میں اُسے سوتی اور سردیوں میں گرم کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ کبھی وہ ہوا میں تیزی آتے اور کبھی بارش برستے دیکھتا ہے۔ ان سب تجربات سے گزرتے ہوئے اس کے زمان و مکان کے تصورات تشکیل پاتے ہیں اور ان میں نکھار آتا ہے۔

- پھر گھر ہی وہ جگہ ہے جہاں بچہ اٹھنے، بیٹھنے، کھیلنے اور کھانے پینے کے آداب سیکھتا ہے۔ بڑوں کو سلام کرنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، کھانے سے پہلے بلکہ ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ کہنا سیکھتا ہے۔ گھر میں خوشی اور غمی کے ماحول میں مختلف رویوں کو دیکھتا ہے۔ اپنے تہوار اور معاشرت کے طرز دیکھتا ہے اور ان میں حسبِ مرتبہ حصہ لیتا ہے۔

بچے کی زندگی میں گھر اور افرادخانہ کے اسی موثر کردار کی بنا پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ گھر اس کا بنیادی اور پہلا مدرسہ ہے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ "School at mother's knee" ہے۔ اس گفتگو سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کوئی معمولی مدرسہ نہیں بلکہ نہایت موثر مدرسہ ہے۔ گھر کا ہر فرد معلم ہے اور بے دام اور نہایت مخلص معلم ہے اور فطری طریقے سے بچے کی نمو تعلیم اور کردار سازی میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔

عقل سلیم کا تقاضا اور صدیوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ بچے کو ایسے موثر مدرسے سے اٹھانے میں جلد بازی نہ کی جائے۔ اپنے تین سے پانچ برس کی عمر کے بچے کے لیے نرسری، کنڈرگارٹن یا مونٹیسوری

سکول کی تلاش میں نکلنے کی بجائے اپنے گھر میں موجود مدرسہ بر زانوئے مادر کے تعلیمی ماحول (Instructional Environment) کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی شعوری کوشش کی جائے۔

اگر حقیقی مجبوری ہو: بچے کی والدہ ملازمت کرتی ہیں اور والدہ کے اوقات کار میں بچے کی دیکھ بھال کا معقول انتظام نہیں یا کسی اور وجہ سے اپنے تین چار سال کی عمر کے بچے کو کسی قبل از ابتدائی تعلیم کے ادارے (Pre Primary Institution) میں داخل کرانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے بچے کے امکانات (Potentialities) کا ادارک کیجیے پھر اس مدرسہ کی تلاش میں نکلیے جو اس کے لیے موزوں ہو۔

جان لیجیے! آپ کا بچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تخلیق کا عظیم شاہکار ہے اسے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ (Five Senses) خصوصاً دیکھنے اور سننے کی جو صلاحیتیں دی ہیں اور اس کی جو دماغی ساخت بنائی ہے اگر ان قوتوں کی مناسب نمو ہو جائے تو نظری طور پر (Theoratically) اس بات کا امکان ہے کہ وہ ایک جاندار نظام تعلیم میں سے گزر کر:

- ایسا عظیم سائنسدان بنے کہ دنیا تسلیم کرے کہ اس سے بڑا سائنسدان چشم فلک نے پہلے نہیں دیکھا
- ایسا فلسفی بنے کہ جو فلسفیانہ گتھیاں پہلے ہو گزرنے والے فلسفی نہیں سلجھا سکے اس کا ناخن تدبر انہیں سلجھا دے
- وہ ایسا ڈاکٹر بنے کہ جن امراض کا علاج آج تک دریافت نہیں ہو سکا، اللہ تعالیٰ کی عطا سے اس کا دستِ شفاء مایوس مریضوں کے لیے دستِ مسیحا ثابت ہو

یقین جانیے بچہ ان امکانات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے:

ع.... ہر ایک بچے میں ہیں صد ہزار امکانات

ان امکانات کو حقیقت میں تبدیل کرنے کا انحصار اس امر پر ہے کہ جس مدرسہ میں آپ اسے داخل کرائیں وہ:

- اس کی قوتِ مشاہدہ کی صحیح تربیت کرے۔
- اُسے ایسا ماحول مہیا کرے جو اُس کے حواسِ مشاہدہ کو اپنی طرف مبذول کرے۔ اپنے آپ کو اس پر

کھولتا چلا جائے، اسے ایسے خوش گوار تجربات میں سے گزارے کہ وہ اس کے شعور و ادراک کا حصہ بن جائیں اور مزید نئے مشاہدات کرنے اور ان سے درست نتائج اخذ کرنے کی بنیاد بھی فراہم کرے۔

- مدرسہ اسے ایسی زبان دے جس میں وہ معلمات کی بات سمجھ سکے اور اپنی بات انہیں سمجھا سکے۔ یہ مدرسہ اس میں اتنی استعداد پیدا کر دے کہ جب وہ پرائمری سکول کی پہلی جماعت میں داخل ہو تو اس جماعت کی درسی کتب کو پڑھ سکے۔

- یہ مدرسہ اسے کھیل کے ایسے منظم مواقع فراہم کرے جن سے وہ لطف اندوز بھی ہو۔ اس میں کامیابی و فتح مندی کا احساس بھی اُبھرے اور ماحول سے استفادہ بھی کرے۔

مجموری طور پر مدرسہ بچے کو اس کی شخصیت کا ایک مثبت تاثر دے۔ اور سب سے بڑھ کر مدرسہ اسے دین کی اُس سلک سے منسلک کرنے کی ابتدا کرے جو اس کی ذات کے کائنات کے ساتھ تعلق اور کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ اس کے تعلق کو استوار کرے کیونکہ یہی تعلق زندگی کو توازن اور حسن عطا کرتا ہے اور وہ قوتِ متحرکہ (Driving Force) بھی عطا کرتا ہے جو فکر و عمل کی دنیا میں فتوحات کی ضامن ہوتی ہے۔

اب سوچیے! کیا ایسا مدرسہ مندرجہ بالا مقاصد کے حصول میں مدد دے سکتا ہے جو:

- بچے کی تین چار برس کی محنت سے سیکھی زبان کو یک قلم مسترد کر دیتا ہے اور ایک اجنبی زبان، اجنبی ماحول میں سکھانا شروع کرتا ہے۔

- جس کی تدریسی زبان کے لیے بچہ اپنے گھر، بازار، سیر گاہوں اور ٹیلی ویژن سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں پاتا۔

- جس کی دیواروں پر Donald Duck, Mickey Mouse اور Pink Panther کے پورٹریٹ پینٹ کیے ہوں یا ان کے قدِ آدم سٹکر چسپاں کیے گئے ہوں۔

- جس میں تدریس کے لیے استعمال ہونے والی تصاویر اور کتب اجنبی ثقافت اور اقدار کا بھرپور انعکاس لیے ہوں۔

- جو غیر ملکی بچوں کے لیے غیر ملکی زبان میں گائے جانے کے لیے لکھے گئے اور غیر ملکی ثقافت کا پس منظر رکھنے والی Nursery Rhymes یاد کراتا ہو۔

جس کے منتظم اور جس کی معلمات وہ تدریسی مواد اور درسی کتب جوان بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں جن کی مادری زبان انگریزی ہے، ان بچوں کو پڑھاتے ہوں جن کی مادری زبان پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی اور اردو ہو۔

ایسا مدرسہ بچوں میں ذہنی الجھاؤ (Complexes) پیدا کرتا ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ اور ذہنی صلاحیتوں کی کماحقہ تربیت نہیں کرتا اور مسلمان پاکستانی بچوں میں ایک ایسا ذہنی سانچہ (Mind Set) بنانے کی ابتداء کرتا ہے جو ہمارے قومی مقاصد، ہماری اقدار اور ہماری ثقافت کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ایسا (Pre Primary) مدرسہ جو ہمارے ملی مقاصد کے حصول کے لیے بلا صلاحیت اور جاندار افراد تیار کرنے کا آغاز کرتا ہو پاکستان میں شاید ہی کہیں پایا جاتا ہو۔

ایسے میں کیا کِیا جائے؟

وہ باشعور نوجوان جوڑے جو احساس رکھتے ہیں کہ پاکستانی بچے ملت پاکستان کی بقا اور ترقی کے لیے ایسے تعلیمی نظام سے فیض یاب ہوں جو ایک طرف اُنہیں اپنے دین اور اپنی اقدار میں پختہ کرے تو دوسری طرف اُنہیں ایسے باصلاحیت اور تخلیقی قوتوں سے مالا مال نوجوان بنائے جو ہر شعبۂ زندگی میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے اہل ہوں، انہیں چاہیے کہ پاکستانی نظام تعلیم کی تشکیل جدید کے لیے سرگرم ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ اپنے، اپنے اعزہ اور اپنے قریبی لوگوں کے بچوں کے لیے معیاری Pre Primary سکول قائم کریں۔ یہ کام چھوٹے پیمانے پر تھوڑے سرمائے سے کیا جا سکتا ہے لیکن اُسے ایک وسیع حلقے میں کیا جانا چاہیے۔

جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب اور خواتین کو اللہ تعالیٰ نے بڑے گھر دیے ہیں اور وہ تعلیم کی تشکیل میں جدید عملاً کردار ادا کرنے پر آمادہ ہوں وہ اپنا ڈرائنگ روم یا گھر میں ایک مناسب کمرہ دن میں ساڑھے تین گھنٹے، ساڑھے تین سے ساڑھے چار سال کے دس بچوں کے ایک پلے گروپ کے لیے مختص کر دیں اور نصف گھنٹہ کے لیے گھر کا لان بھی۔

- اس گروپ میں ان کے اپنے بچے کے علاوہ قریبی ہمسایوں اور عزیزوں کے بچے شامل ہوں۔
- اس پلے گروپ کے لیے اعلیٰ قسم کے کھلونے اور دیگر متعلقہ سامان فراہم کیا جائے۔

- اس گروپ کو چلانے کے لیے ایک تربیت یافتہ معلمہ کی خدمات حاصل کی جائیں۔

- اس پلے گروپ کے لیے کھلونوں، فرنیچر، تعلیمی معاونات کی خریداری، روزمرہ اخراجات اور معلمہ کی تنخواہ کے لیے گروپ میں شامل بچوں کے والدین اجتماعی فنڈ قائم کریں۔

- اس پلے گروپ کی تدوین میں بچوں کی نفسیات، طریقہ ہائے تدریس اور نصابی مواد (Curricular Content) کے انتخاب میں ان مغربی مفکرین کی کاوشوں سے استفادہ کیا جائے جنھوں نے سکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں غور و فکر کیا اور عمدہ پروگرام کیے خصوصاً کومینیس (John Amos Comenius) روسو (Rousseau) پستالوزی (Pestalozzi) فروبل (Friedrich Froebel) میریا مانٹیسوری (Maria Montessori) اور ژاں پیاژے (Jean Piaget) لیکن ان ہدایات کی پیروی بھی لازماً کی جائے جو ہمیں نبیٔ رحمت معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ملی ہیں۔

- اس پروگرام میں بچوں کے لیے استعمال ہونے والا ہلکا پھلکا لیکن پائیدار فرنیچر گھر کے برآمدہ کے ایک کونے میں سٹیک (Stack) کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کمرہ جماعت میں تدریس میں معاون اور کھیل کا سامان ایک چھوٹی الماری میں سٹور کیا جا سکتا ہے۔ مدرسہ کے دن کے آغاز سے دس منٹ پہلے یہ سامان اور فرنیچر لگایا جا سکتا ہے اور چھٹی کے بعد دس منٹ میں پھر سٹور کیا جا سکتا ہے۔ یوں تقریباً ۴ گھنٹے استعمال کے بعد یہ کمرہ گھر کے استعمال کے لیے فارغ کیا جا سکتا ہے۔

- آخر میں ہم یقین دلاتے ہیں کہ گھر میں قائم کردہ اس پلے گروپ میں بچے ایسے مشاغل اور کھیلوں اور ان کے ذریعے آموزش (Learning) میں ایسے ہی مصروف رہیں گے جیسے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں ان کے ہم عمر۔ اور آئندہ پرائمری سکول کی رسمی تعلیم (Formal Education) کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو جائے گی۔

ہمارے مجوزہ پلے گروپ میں تدریس کی زبان اردو ہوگی۔

اس سے یہ تاثر لینا درست نہیں ہوگا کہ ہم انگریزی زبان کی تدریس کے خلاف ہیں۔ انگریزی کی تدریس کی بہت اہمیت ہے لیکن اتنی ہی جتنی سائنس، ریاضی، جغرافیہ، ہماری اپنی تاریخ اور اردو کی۔ اس سے زیادہ نہیں اور موجودہ حالات میں تو پاکستان میں ہزاروں ایسے نوجوان ہر سال ہمارے تعلیمی نظام

سے تیار ہو کر نکلنے چاہئیں جو نہایت اعلیٰ معیار کی انگریزی لکھ بھی سکتے ہوں اور بول بھی سکتے ہوں۔ آخر تہذیب مغرب کے علمبرداروں کی خون آشامی کے سدباب کا ایک محاذ ان کی اپنی زبان میں مکالمہ کے زور پر انہیں اُن کی غلط روّش کا احساس دلانا بھی ہے۔

تعلیم کی تشکیلِ نو کی ہماری مجوّزہ سکیم میں انگریزی کی تدریس کا بھی مقام ہے اور اس سکیم میں سے گزرنے والے طالب علم کے آٹھویں جماعت پاس کرنے پر انگلش میں اس کی اہلیت کسی بھی انگلش میڈیم سکول کے ہم درجہ طالب علم کی اہلیت سے کم نہ ہوگی۔

نرسری اور کنڈر گارٹن کیسے مفید ہو سکتے ہیں؟

انسانی معاشرہ کی مثال بہتے دریا کی سی ہے۔ جس طرح بلند پہاڑوں پر ہر آن پگھلنے والی برف دریاؤں کی روانی کے لیے پانی فراہم کرتی ہے ایسے ہی ہر آن پیدا ہونے والے بچے انسانی معاشرہ کی بقاء اور تسلسل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت سے لا پروائی معاشرہ کے انتشار کا سبب بنتی ہے۔

ہمارا معاشرہ ایک عام انسانی معاشرہ نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ ہے۔ اور ایک اسلامی معاشرہ اپنی حقیقی صورت میں ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس کا ہر فرد اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے اور فی الواقع اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

انسان کی تخلیق کا مقصد

انسان کے متعلق قرآن میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس کو اللہ نے بلا وجہ (عبث) نہیں پیدا کیا بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں وہ ہوائے نفس، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی باطل ترغیبات (Temptations) سے بچتا ہوا زندگی کی اس صراط مستقیم پر چلتا رہے جو اس کے رب نے اس کے لیے کھولی ہے۔ اگر وہ بندگی کا یہ رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں کامیابی سے نوازے گا اور اگر وہ نفس یا شیطان کی ترغیب سے بہک کر یا اُس سے ڈر کر اِس صراط مستقیم کو چھوڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت کی اسی وادی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔

انسان کو اِس مقصد کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔

”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ“

اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلیٰ ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں صرف وہ ان کا اہل بن سکا ہے۔ قرآن میں مختلف اسالیب سے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اچھائی اور برائی میں امتیاز بخشا ہے اور وہ اپنی فطرت میں خیر کو پسند کرنے والا اور شر کو ناپسند کرنے والا ہے۔

مقصدتخلیق کو پورا کرنے کالائحہ عمل

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَ اللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ“

”اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اِس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے۔[(۱)] تا کہ تم شکر گزار بنو۔“

انسانی بچہ اپنی پیدائش کے وقت گوشت پوست کا ایک بے بس لوتھڑا ہوتا ہے۔ اُسے کسی شے کا علم نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے حصول علم کے لیے اُسے سننے کو کان، دیکھنے کو آنکھیں اور ان اعضاء کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات کو زندگی بھر کا اثاثہ بنا لینے، اُن معلومات پر غور وفکر کر کے اُن سے نتائج اخذ کرنے اور اپنے وقت پر اسی غور وفکر کے نتیجہ میں انکشاف واکتشاف کی تخلیقی قوتیں حاصل کر لینے کے لیے دل اور دماغ عطا کیا ہوتا ہے۔ بچہ گھر کے ابتدائی مدرسہ میں غیر رسمی تعلیم سے اور تین قوتوں کے استعمال سے معلومات حاصل کرتا ہے اور اپنے ابتدائی تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ پھر ابتدائی مدرسہ سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک علم کا حصول، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تحقیق اور یونیورسٹیوں سے باہر نت نئے علوم کی دریافت، ہر طرح کی تحقیق اور ہر طرح کی ٹیکنالوجی کی ایجاد انہی تین قوتوں سمع، بصر اور فواد کی رہین منت ہے۔

مقاصد

(۱) آیت مذکورہ میں لفظ الافئدۃ استعمال ہوا ہے جو فواد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں یعنی وہ مقام جو انسان کے شعور وادراک، جذبات وخواہشات، عقائد وافکار اور نیتوں اور ارادوں کا محل ہے۔

۱۔ ایک نرسری یا کنڈرگارٹن کے مقاصد میں سے اولین مقصد انہی تین قوتوں سمع (Listening)، بصر (Observation) اور فواد (Thinking) کی تربیت، آبیاری اور نمو ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد بچے کو ایسی زبان بولنا سکھانا ہے جو رسمی تعلیم کے آغاز یعنی پرائمری سکول میں ذریعہ تعلیم (Medium of Instruction) ہو۔

۳۔ بچے کو ایسے آداب سکھانا جو معاشرہ کی ثقافت کا حصہ ہوں۔

۴۔ بچے کو ایسا خوشگوار، صحت مندانہ اور صحت بخش ماحول فراہم کرنا جو اس کی مناسب جسمانی، ذہنی اور جذباتی نمو میں معاون ہو۔

درمیانی مرحلہ

نرسری یا کنڈرگارٹن گھر اور مدرسہ کے درمیان کا مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ کھیل کھیل میں غیر رسمی تعلیم کا ادارہ ہوتا ہے جس کا سارا پروگرام مندرجہ بالا مقاصد کے پیش نظر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اپنے گھر کے اندر مناسب جگہ میں چند گھنٹے کے لیے بچے کو سکول سے ملتے جلتے ماحول میں رکھنے کا عمل پرائمری سکول میں اس کی منتقلی آسان اور پھر اُس سے بھرپور استفادہ میں معاون ہوگی۔

ہماری رائے

نرسری، کنڈرگارٹن اور مانٹیسوری پروگرام کے اداروں کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ پاکستان میں ان کی اصل افادیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اُنہیں مغربی تہذیب کے اندر انجذاب کا پہلا قدم بنا دیا گیا ہے۔ قبل از پرائمری تعلیم (Pre Primary Education) کا مطلب انگریزی زبان کی تعلیم سمجھ لیا گیا ہے اور انگریزی زبان کے ذریعے اٹھنے بیٹھنے اور معاشرت کے دیگر مغربی آداب سکھائے جاتے ہیں۔ نرسری رائمز، کارٹون فلموں اور تدریسی مواد (Printed teaching material) کے ذریعے بھی مغربی تہذیب معصوم بچوں کے ذہنوں پر مسلط کی جاتی ہے۔ پھر تعلیم کے بنیادی اصولوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو بولنے والے بچوں کو وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو اُن بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں جن کی مادری زبان انگریزی ہے۔

ایسے پلے گروپ جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو، جو ہمارے بچوں کو حواس کے استعمال کی تربیت دیتے ہوں اور اُن کی ذہنی نمو میں معاون ہوں، وقت کی ضرورت ہیں۔ ہمیں اُن کے قیام کی منظم کوشش کرنی

چاہیے۔ یہ اپنے بچوں کے ساتھ بھلائی اور قومی خدمت کا عظیم کام ہوگا۔

ہمارے تجویز کردہ پلے گروپ کے قیام اور چلانے میں ہماری معاونت حاصل کرنے کے لیے رابطہ فرمائیں:

موبائل:0333-4278012، ای میل:azizahmadmirza@yahoo.com

☆☆☆☆☆

تعلیم و تربیت عبدالرشید ارشد*

علمی و تعلیمی انحطاط

علم، اور یہ انحطاط پذیر ہو، بظاہر سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور گزرتے دن بھی اس کی 'نفی' کرتے دیکھے جا رہے ہیں۔ مگر مخبر صادق حضرت محمد ﷺ نے قیامت کے وارد ہونے سے قبل رونما ہونے والے واقعات میں اس حقیقت کو بھی شامل فرمایا کہ "قیامت بَرپا ہونے سے قبل علم دنیا سے اٹھا لیا جائے گا" (مفہوم)۔ آج ہمارے گردو پیش علم ہی نہیں علوم کے "ڈھیر" لگے دیکھے جا رہے ہیں بلکہ ہر نیا سورج نئے علم کو نئے انداز سے متعارف کراتا دیکھا جا رہا ہے۔ بظاہر اس صورت حال کو بھی جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔

علم کا مرکز و منبع جاننا بہت ضروری ہے کہ اِس کے بغیر موضوع کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ قرآن حکیم سے زیادہ معتبر گواہی کہیں سے نہیں مل سکتی جو ہمیں بتا رہا ہے کہ حضرت آدمؑ کو تخلیق کر کے انہیں اپنی طرف سے علم کا تحفہ عطا فرمایا: وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا یعنی آدم علیہم السلام کو علوم سے روشناس کرایا گیا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ اُن کی ذرّیت کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کے اعزاز سے نوازنا تھا اور پھر یہ بھی کہ اس نائب کو عملی زندگی کے بدلتے تقاضوں سے خالق باخبر تھا اور اسی مناسبت سے اس نے بتدریج بہتر راہنمائی کا انتظام یوں فرمایا کہ سینۂ دھرتی پر مختلف علاقوں میں بسنے والے انسانی معاشروں میں اپنے منتخب بندوں کو منصبِ نبوت پر فائز کیا، بعض کو محض وحی کے ذریعے ہدایات دیں اور بعض کو وحی کے

*بانی النور ٹرسٹ، جوہر آباد

ذریعے قائم رہنے والی کتابوں کی نعمت سے نوازا مثلاً صحفِ ابراہیمی، زبور، تورات، انجیل اور نبی آخر الزماں ﷺ کو آخری مدلّل و مفصّل کتاب قرآنِ حکیم کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی۔ یہ ہے خالق کا مخلوق تک علم پہنچاتے رہنے کا محفوظ نظام، یہ ہے علم کا سفر۔

نبی اکرم ﷺ کے ذریعے آخری اُمتّ کو جس قابلِ عمل علمی سرمایہ سے سرفراز فرمایا گیا اُس کے آغاز میں لَا رَیْبَ فِیْہِ لکھ کر یہ طے کر دیا گیا کہ اس کتابِ علوم میں جو کچھ بھی ہے ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ہر بات، ہر علم ٹھوس بنیاد پر عطا کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے جب بنیاد مضبوط اور ٹھوس ہو تو عمارت پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں مسلمان فاضلین نے علم کے ہر شعبہ کو اُس دور کی انتہاؤں تک نوازا۔ مسلمان سائنسدان، ریاضی دان، ماہرینِ ارضیات وفلکیات، ماہرین طب وجراحت، ماہرین معاش ومعیشت، ماہرین آئین وقانون اور ماہرین تعلیم چہار سو چھائے ہوئے تھے۔ اُن کی تصانیف، اُن کے کتب خانے۔ غرض وہ جو ورثہ بھی بنی نوع انسان کے لیے چھوڑ گئے غیر بھی اُس کے معترف ہوئے۔

علم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ انسان میں ہمہ جہت اعلیٰ وارفع کردار واخلاق کی اقدار کو نہ صرف یہ کہ جنم دیتا ہے بلکہ لمحہ لمحہ نکھارتا بھی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ خالق کا مطلوب کامل انسان تعمیر کرتا ہے۔ تاریخ نے ہر دور کے انسان کو اِسی کسوٹی پر پَرکھا ہے۔ کسی کی ستائش کی تو کسی کو رَد کیا اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ کوئی بھی ذی شعور اس پہلو پر سوچ بچار کر لے تو اُسے اتفاق کرتے ہی بنے گی۔ آج چہار سو علم نہیں علوم کی بہار ہے۔ علوم کے ''تقسیم کار'' اداروں کی چمک دمک دیدنی ہے۔ دعوے ہر دوسرے پر سبقت لے جا رہے ہیں۔ طالب علموں کے بستے ان کے اپنے وزن سے زیادہ بھاری دیکھے جا رہے ہیں۔ اداروں کے واجبات اور کتابوں کاپیوں کی قیمتیں بھی والدین 'بخوشی' برداشت کرتے ہیں کہ اولاد نکھرے، اخلاق وکردار کے ساتھ اُن کا اور اپنا مستقبل سنوارے اور معاشرے میں خیر پھیلانے کا سبب بنے۔

سماج ومعاشرہ اور والدین کی خواہش ایک طرف اور تدریجی علمی انحطاط کی داستانِ غم دوسری طرف۔ خواہش دم توڑتی دیکھی گئی کہ مارکیٹ میں مطلوب کارندے نہ دستیاب ہو سکے جو سماجی ومعاشرتی سطح پر نکھار پیدا کر سکتے۔ گزرتے ایام چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ بانئ پاکستان محمد علی جناحؒ اور

علامہ اقبالؒ کے خوابوں کو سچ کر دکھانے والے ایک روز بھی علمی ورثہ کے امین ثابت نہیں ہوئے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان جس کا آئین و دستور بقول قائد اعظم، قرآن حکیم ہے اور جو ہر دور کے لیے قابل عمل ہے۔ مگر اُس سے راہنمائی لیتے انفرادی و اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا کوئی خواہشمند دیکھنے میں نہیں آتا بلکہ A لیول یا O لیول کے شیدائیوں سے علمی مارکیٹ بھری ہوئی ہے۔

ہماری سوچ اور رائے کو، ''اہل علم'' رجعت پسندانہ اور تاریک راستوں کے دِلدادہ، کہہ کر ردّ کر سکتے ہیں مگر ہمیں پھر بھی اپنی سوچ کے درست ہونے پر اصرار ہے اور اس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اگر نظامِ تعلیم اپنے اصل، یعنی قرآن و سنت کے تابع ہوتا اور فارغ ہونے والے ہر سطح اور ہر شعبہ کے طالب علم عملی زندگی میں اپنی تعلیمی وراثت کو محفوظ رکھتے تو آج ملک میں کرپشن نہ ہوتی، کبھی مارشل لا کی نوبت نہ آتی، کبھی 'جمہوریت' بدنام نہ ہوتی۔ ایک آدھ یا چند کالی بھیڑیں بھی دبی رہتیں اور کبھی مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکتیں۔ نہ اپنوں پر فوج کشی کی ضرورت پڑتی اور نہ خودکش حملے سہنے پڑتے۔ قومی حمیّت و غیرت دشمن کی آنکھ سے آنکھ ملا کر حقوق کی حفاظت کی جرأت بخشتی۔

آج ہم جہاں کھڑے ہیں زندگی کا ہر شعبہ انحطاط کا نوحہ سنا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ لارڈ میکالے نے گہری تحقیق کے بعد جو نظام تعلیم متحدہ ہندوستان کے لیے طے کیا تھا قیام پاکستان کے بعد نہ صرف یہ کہ ہم نے اسے جاری و ساری رکھا بلکہ امریکہ و یورپ کے ایما پر 'روشن خیالی' کی کلغی سر پر سجانے کی خاطر اس میں سے اسلام کو خارج کرتے اور یورپی روشن خیالی کو اس کی جگہ دیتے رہے۔ آج تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی سوچیں اور ان کے عمل خالصتاً کاروباری ہوتے ہیں۔ آج تعلیمی ادارے خالصتاً کاروباری ادارے ہیں۔ علم بِکتا ہے: سکول و کالج میں، ٹیوشن سنٹروں میں اور اکیڈمیوں میں۔

یہ علم ہی ہے جس سے عدل و انصاف کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ علم اگر خالق کے عطا کردہ علم کے تابع ہو تو انسانیت کی فوز و فلاح اور تحفظ و خوشحالی کی ضمانت اور اگر ''روشن خیال علم'' ہو تو قدم قدم پر اور لمحہ لمحہ عدل و انصاف کی سودے بازی ہوگی۔ جہاں اور جب انصاف جس قدر آپ کے تجربہ میں آئے تجزیہ کریں گے تو وہاں سے آپ کو اُسی قدر علم اصل سے قریب یا اصل سے دور دیکھنے کو ملے گا۔ انصاف اپنے پرائے کی پہچان نہیں رکھتا۔ یہ اندھا بھی نہیں ہوتا کہ اندھے کی لاٹھی کی طرح برستا ہے۔ انصاف کا نکھار ہر

کسی کو نظر آتا ہے، اس حقیقت پر اسلامی نظام عدل کے بے شمار واقعات اقوام عالم کے سامنے ہیں۔ بے چوں و چرا ں خلیفہ وقت قاضی کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔

یہ بھی علم ہی کی بدولت ممکن ہوتا ہے کہ کاروبار زندگی یا تجارت عبادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے اور یہ علم سے کھلا انحراف ہی تو ہے کہ عملی زندگی کے کسی شعبہ میں دیانت و امانت نام کی کوئی شے دیکھنے میں نہیں آتی۔ ملاوٹ ہو یا ناپ تول میں کمی، دکھائیں کچھ اور دیں کچھ، اس روّیے پر فخر کیا جائے کہ ہم کامیاب تاجر ہیں۔ اس فن کے ''ماہرین'' اگر کسی یونیورسٹی کے ڈگری ہولڈر ہوں تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علم نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اگر حقیقی علم سرمایۂ حیات ہوتا تو اُن کے عمومی روّیوں میں نمایاں مثبت تبدیلی ہر کوئی دیکھ سکتا جو آج نظر نہیں آ رہی۔ مذکورہ ہر نشانی چیخ رہی ہے کہ قوم بتدریج تعلیمی انحطاط کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ راہ تباہی کی راہ ہے۔ سنبھلنے کا موقع صرف آج ہے۔

فہم دین　　مدیر

مغرب زدہ اسلام
عبدالقادر الجزائری کے جہادی رویے کے حوالے سے
عمار ناصر اور مفتی ابولبابہ کا مباحثہ

ہم سے ایک قاری نے سوال کیا ہے کہ عبدالقادر الجزائری کے حوالے سے جو بحث ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ اور 'ضرب مومن' میں جاری ہے، اس کے بارے میں ہماری رائے کیا ہے؟

مختصراً عرض ہے کہ مفتی ابولبابہ صاحب کا موقف صحیح ہے لیکن ان کا اسلوبِ اظہار روایتی اور جذباتی ہے۔ جاوید غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے خلاف لکھنے والے بعض دیگر احباب جیسے سید خالد جامعی صاحب اور محمد رفیق چودھری صاحب کا اور بعض جرائد جیسے ماہنامہ محدث، ماہنامہ صفدر، ماہنامہ ساحل ۔۔۔ کا انداز نگارش بھی جذباتی ہوتا ہے۔ اگرچہ قارئین کا ایک حلقہ اسے پسند کرتا ہے لیکن سنجیدہ اہل علم اس کے مقابلے میں غیر جذباتی اور مدلل انداز کو ترجیح دیتے ہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ خود غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب غیر جذباتی، شائستہ اور مدلل انداز میں لکھتے ہیں۔ اس حوالے سے حافظ زبیر صاحب اور پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کا شائستہ، سنجیدہ اور مدلل طرز تحریر مستحق ستائش

ہے۔خود ہم نے اکتوبر ۲۰۱۱ء میں جب غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے تجدد کے خلاف البرہان کا خصوصی شمارہ شائع کیا تھا تو ہم نے بھی معروضیت اور شائستگی کو نبھانے کی سعی کی تھی۔

ہمارا موقف پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ ہمیں مغرب زدہ اسلام نہیں چاہیے۔ جو علماء کرام، اسلامی سکالرز اور دانشور عصر حاضر کے مسائل کا ایسا حل پیش کرتے ہوں اور اسلام کی ایسی تعبیر کرتے ہوں جس میں وہ مغرب کی فکر، اصولوں اور اقدار سے مرعوب ومتاثر نظر آئیں، تو ہمارے نزدیک یہ غلط اور نا قابل قبول ہے۔تاہم ایسے لوگوں کو جواب متانت اور دلیل ہی سے دینا چاہیے نہ کہ دشنام سے۔

مذکورہ مسئلے میں عمار ناصر ساحب، عبدالقادر الجزائری اور ان کی حکمت عملی کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ جہاد میں شکست کے آثار دیکھ کر انہوں نے استعمار سے صلح کر لی، پر امن رہ کر اس سے فائدے اٹھائے، عیسائیوں کی جانیں بچائیں [سرسید کی طرح]، فری میسن تحریک میں شامل ہو گئے، استعمار سے جاگیریں لیں، یہودیوں سے مل کر کاروبار کرنے لگے اور اخلاقی لغزشوں میں مبتلا ہوئے (ان کے حلقۂ احباب میں اخلاق باختہ مغربی عورتیں شامل تھیں اور ان کے حرم میں ہر وقت چار خوبصورت نوجوان لڑکیاں شامل ہوتی تھیں [استعمال شدہ کو وہ طلاق دیتے رہتے تھے] اور ایک عینی شاہدہ نے تو ان کی بیویوں کی تعداد پانچ بتائی)۔لہذا اہل مغرب خصوصاً امریکی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔اور جب امریکی عبدالقادر الجزائری کی تعریف کرتے ہیں تو عمار ناصر صاحب بھی ان کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں سچا مجاہد قرار دیتے ہیں۔عمار ناصر صاحب کے والد گرامی مولانا زاہد الراشدی صاحب حسب معمول اپنے بیٹے کی پشت پر کھڑے ہیں اور یہ موقف رکھتے ہیں کہ یہ معمولی علمی اختلاف ہے اور علماء کو اس پر سیخ پا نہیں چاہیے اور عبدالقادر الجزائری کے تجربات سے سبق سیکھنا چاہیے۔

ہم مولانا راشدی صاحب سے متفق ہیں کہ علمی اختلاف رائے میں تحمل و برداشت سے کام لینا چاہیے اور دلیل کا جواب دلیل ہی سے دینا چاہیے لیکن ہم مولانا محترم سے پوچھتے ہیں کہ اس علمی اختلاف رائے کی حدود کیا ہیں اور اس کا منبع کیا ہے؟ ایک بات میں اختلاف، دوسری بات میں اختلاف، احناف سے اختلاف، ائمہ اربعہ سے اختلاف، اجماع امت سے اختلاف، فقہاء سے اختلاف، محدثین سے اختلاف اور محقق صوفیا سے اختلاف۔ہم نے غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے مؤقف اور جمہور سے اختلاف کے اکثر واقعات کا (اپنی اکتوبر والی تحریر میں) ایک ایک کر کے جائزہ لیا اور یہ ثابت کیا کہ

ان سب میں یہ چیز مشترک ہے کہ انہوں نے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار کا لحاظ رکھا ہے اور اس کے مطابق اسلامی احکام کی تعبیر وتشریح کی ہے۔ لہذا اگر ہم کہیں کہ غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر ہیں اور اس کی روشنی میں مسائل کی تنقیح اور احکام شریعت کی تعبیر وتشریح کرتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟

دوسری بات یہ کہ جذباتیت اور اشتعال کی بھی ایک شرعی حیثیت ہے۔ بلاشبہ قرآن وسنت غصہ دبانے، تحمل، برداشت، رواداری، حلم، تدبر اور تواضع کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہی قرآن و سنت ظلم برداشت نہ کرنے بلکہ ظالم و جابر سے لڑ جانے پر بھی ابھارتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں کتب احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ ذاتی ایذا برداشت کر لیتے تھے لیکن انتہاک حدود اللہ پر غصے سے آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ فاطمہ مخزومیہ کی چوری کے واقعہ پر حضرت اسامہؓ کی سفارش پر ہوا۔ کفار کے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ ﷺ نے حضرت حسانؓ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جن افراد نے نبی ﷺ کی کردار کشی کر کے اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی، ان کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں ڈھونڈو، پکڑو اور قتل کر دو خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا حالانکہ آپ ﷺ سے بڑھ کر حلیم اور خلیق کوئی نہ تھا۔

اسی طرح ثبوت زنا کے لیے جب چار گواہوں کی شرط والی آیات اتریں تو حضرت سعدؓ نے کہا چہ خوب! اگر میں اپنی بیوی کے بستر پر غیر مرد کو پاؤں تو چار گواہ ڈھونڈنے نکلوں اور تلوار سے ان کا خاتمہ نہ کروں؟ آقائے دو جہاں ﷺ نے حضرت سعدؓ کی غیرت کی تعریف کی لیکن فرمایا کہ قانون وہی ہے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ چنانچہ قانون وہی ہے اور اس کی حکمتیں بھی واضح ہیں لیکن اگر کوئی اپنی بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر اور مشتعل ہو کر انہیں قتل کر دے تو جدید مغربی قانون میں بھی اس کی سزا وہ نہیں جو قتل عمد کی ہوتی ہے۔ اسی طرح جو مردود نبی پاک ﷺ کی توہین کرتا ہے، قانون اور اصول یہی ہے کہ اسے حوالۂ قانون کیا جائے تاکہ عدالت اسے کیفر کردار کو پہنچائے لیکن اگر کسی مسلمان کے سامنے توہین رسالت ہو اور وہ مشتعل ہو کر مجرم کو قتل کر دے تو اسے قتل کے جرم میں پھانسی نہیں دی جائے گی بلکہ عدالت دیکھے گی کہ اس نے جرم کیوں کیا؟ اگر اس نے محبت رسول ﷺ سے مغلوب ہو کر اور توہین

رسالت پر مشتعل ہو کر مرتکب توہین کو جہنم رسید کیا تو عدالت اسے باعزت بری کر دے گی بصورت دیگر اس سے قتل ناحق کا قصاص لے گی۔ یہ جو ہم نے لکھا ہے یہ ہماری رائے نہیں یہ آقائے دو جہاں ﷺ کا فیصلہ اور طرز عمل ہے اور یہ فیصلہ آپ ﷺ نے ایک بار نہیں کئی بار فرمایا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔

ہماری بات کا خلاصہ اور مدعا یہ ہے کہ اگر چہ اسلام بالعموم بدزبانی کی مذمت کرتا ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں جذباتیت اور اشتعال کی بھی ایک شرعی حیثیت ہوتی ہے۔ زیر بحث معاملے میں اس اصول کا اطلاق کر کے دیکھ لیجیے: مغربی فکر و تہذیب صرف اتنا ہی نہیں کہ خلاف اسلام ہے بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تہذیب کے علم بردار اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن ہیں، وہ تمہیں دین سے پھیر دینا چاہتے ہیں اور وہ تمہاری بربادی میں خوش ہیں۔ اور ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے۔ ہم تاریخ کی بات نہیں کرتے کہ صلیبیوں نے کیا کیا، کس طرح انہوں نے سازشوں سے عربوں اور ترکوں کو لڑایا، مسلمان ملکوں پر قبضہ کیا، ان کی صدیوں کی کمائی لوٹی، انہیں تہ تیغ کیا، کچلا، خلافت ختم کی، مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹا.... ہم آج کی بات کرتے ہیں، آنکھوں دیکھی بات کرتے ہیں اور اپنے مشاہدے کی بات کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے عراق میں لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ نہیں کیا؟ کیا انہوں نے افغانستان کا تورا بورا نہیں بنایا؟ کیا انہوں نے چیچنیا اور فلسطین میں مسلمانوں کو نہیں کچلا؟ کیا ان کے ڈرون آج بھی وزیرستان میں عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں بنا رہے؟ کیا بے کسوں اور بے نواؤں کے خون کی اس ارزانی پر ہم ماتم بھی نہ کریں؟ روئیں بھی نہ؟ کیا بے غیرت بن کر اپنے ضمیر کو سلا دیں؟ کیا ان واقعات کی ایسی توجیح کریں جو اہل مغرب کو پسند ہو؟

ہم مانتے ہیں ہم کمزور ہیں۔ ہم کب کہتے ہیں کہ ہم مغرب سے لڑنا چاہتے ہیں۔ ہم مغرب سے لڑنا نہیں چاہتے لیکن اگر وہ ہمارے گھر آ کر ہمیں مارے، ہمارے سامنے ہمارے بچوں کو قتل کرے، ہماری عزتیں لوٹے، ہمارے گھر جلائے تو کیا ہم بے غیرت بن کر کھڑے دیکھتے رہیں اور ٹس سے مس نہ ہوں؟ نہیں مولانا صاحب! جارح کی مزاحمت کا حق تو ہمیں دنیا کا ہر قانون دیتا ہے یہاں تک کہ امریکہ اور مغرب کی لونڈی اقوام متحدہ بھی دیتی ہے۔ اگر اسلام کے قانون پر ہم عمل نہیں کر سکتے تو اس کی اجازت تو خود جارحین کا قانون بھی دیتا ہے۔ آج جب نہتے افغان مجاہدین دس سال تک جان و مال کی قربانیاں دے کر امریکہ اور ناٹو کو شکست کے کنارے پر لے آئے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ عبدالقادر الجزائری کی

پسپائی سے سبق سیکھو! آپ کے اس رویے پر اگر کوئی جذباتی اور مشتعل ہو کر آپ کو 'مغرب کا گماشتہ' کہتا ہے تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تحمل اور برداشت سے کام لو کہ یہ علمی اختلاف رائے ہے۔ معاف کیجیے گا! کیا آپ کا موقف اور طرز عمل ویسا ہی نہیں جیسا سرسید، قادیانی اور پرویز کا تھا؟ تو لوگ آپ سے سرسید اور قادیانی جیسا سلوک کیوں نہ کریں؟

خلاصہ یہ کہ جذباتیت اور اشتعال کی بھی ایک شرعی حیثیت ہے، قانونی جواز ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علمی گفتگو کی بنیاد دلیل پر ہوتی ہے اور نارمل حالات میں بات شائستگی، سنجیدگی اور متانت ہی سے کرنی چاہیے لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اگر آپ کا طرز عمل فریق ثانی کے دینی جذبات مجروح کرتا اور اشتعال اور جذباتیت کا سبب بنتا ہے تو اس کے جواب کی گنجائش بھی شریعت میں موجود ہے۔

☆☆☆☆

تفہیم دین

تحریر: جلال الدین عمری
ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر محمد امین

خدمت خلق
کے بارے میں قرآن وسنت کی تعلیمات

خدمتِ خلق کا حکم قرآن مجید میں

قرآن مجید نے اپنے آغاز نزول ہی سے بنیادی عقائد کے بعد دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا۔ ایک یہ کہ انسان کا اللہ سے تعلق مضبوط ہو، وہ صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے۔ دوسرے یہ کہ وہ انسانوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے، حق داروں کا حق پہچانے اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ قرابت داروں، ہمسایوں، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی جو ضرورتیں پوری کر سکتا ہے پوری کرے۔ کوئی بھی شخص جو اس کی خدمت کا مستحق ہو اور جس کی خدمت کرنا اس کے امکان میں ہو، وہ اس کی خدمت سے محروم نہ رہے۔ وہ طاقت ور ہے تو کمزوروں پر دست درازی نہ کرے بلکہ ان کو سہارا دے اور ان کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی اپنے جان ومال اور عزت وآبرو کی طرح حفاظت کرے۔ کسی کے ساتھ دھوکہ اور فریب کا معاملہ

نہ کرے بلکہ ہر حال میں عدل وانصاف اور دیانت وامانت پر قائم رہے۔اس کا وجود معاشرہ کے لیے کلفت وآزار کا باعث نہ ہو بلکہ آسائش وراحت کا سبب بنے اور اس کی ذات سے سب کو نفع پہنچے، کسی کو ضرر نہ اٹھانا پڑے۔قرآن مجید نے ان باتوں کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ بار بار کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔اس کا ایک بڑا اچھا اور عمدہ نمونہ ہمیں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ملتا ہے۔فرمایا کہ:

''اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خصوصیت سے ان کا خیال رکھو۔ان کے سامنے تواضع اور خاکساری کے ساتھ جھک جاؤ۔درشتی اور سختی سے پیش نہ آؤ اور ان کے لیے دعائیں کرتے رہو۔قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو۔اگر اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے ان کی مدد نہ کرسکو تو نرمی سے معذرت کردو۔اپنی اولاد کو اس خطرے سے نہ مار ڈالو کہ تم ان کو کچھ کھلا نہ سکو گے۔اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کھلائے گا اور انہیں بھی کھلائے گا۔قتل اور وہ بھی اپنی اولاد کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بے حیائی کا کام اور زندگی کا غلط راستہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی جان کو باعزت اور محترم ٹھہرایا ہے۔اس لیے جب تک حق وانصاف اس کی جان لینے کا تقاضا نہ کریں اس کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو۔یتیم کو بے آسرا سمجھ کر اس کا مال نہ کھاؤ۔جب وہ جوان ہوجائے تو اس کا مال اس کے حوالے کردو۔عہد و پیمان کو پورا کرو۔اللہ کے ہاں اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، ناپ تول میں کمی نہ کرو۔جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے بارے میں زبان نہ کھولو۔یاد رکھو، کان، آنکھ، دل ودماغ ہر ایک کے بارے میں اللہ کے ہاں سوال ہوگا۔تکبّر اور غرور کی چال نہ چلو۔تم نہ ٹھوکر مار کر زمین کا سینہ چاک کرسکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔یہ باتیں تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳۔۳۸)*

خدمتِ خلق شکر نعمت کا تقاضا ہے

اس دنیا میں کچھ انسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں اور کچھ انسان ان سے محروم ہیں۔قرآن مجید کا پہلی قسم کے انسانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ دوسری قسم کے انسانوں کی خدمت کریں۔ان کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے میں مدد دیں۔جس شخص کو اللہ

* یہی مضمون کسی قدر اختصار کے ساتھ سورۂ انعام (۶: ۱۵۱۔۱۵۲) میں بیان ہوا ہے۔یہاں جن باتوں کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک ایک پر قرآن مجید نے متعدد مقامات پر زور دیا ہے۔

نے دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے لیے کان، بولنے کے لیے زبان، دوڑ دھوپ کرنے اور محنت مشقت کے لیے مضبوط دست و بازو، سوچنے سمجھنے کے لیے دل و دماغ اور زندگی گزارنے کے لیے سامانِ عیش عطا کیا ہے، اس کا فرض ہے کہ جو شخص معذور ہے، جس کو وسائل حیات میسر نہیں ہیں اور جو زندگی کی تگ و دو میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہے اس کو بے سہارا نہ چھوڑ دے کہ وہ بھیک مانگنے یا خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائے، بلکہ اس کے زندہ رہنے کا ساز و سامان اور اس کے سکون و راحت کے اسباب فراہم کرے۔

اس لیے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اللہ کی طرف سے ملتا ہے اس لیے اسے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور جو خدمت کے مستحق ہیں ان کی خدمت کی جائے۔ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت میں اس کے بندوں کا حق ہے۔ اس حق کو ادا کیے بغیر اس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی نعمتوں کو پانے کے بعد اگر کسی کے اندر اس کی مخلوق کی خدمت کا جذبہ نہ اُبھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل ان نعمتوں کے احساس ہی سے خالی ہے۔ قرآن مجید نے اس بے حسی پر سخت سرزنش کی ہے اور اس کے برے انجام سے آگاہ کیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا:

''اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۔ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ اَوْ اِ ... طْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ۔ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ۔''

(البلد ۹۰: ۹-۲۰)

''کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور اس کو (حق و باطل) کی دونوں راہیں نہیں دکھادیں؟ لیکن وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ تم جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھڑانا (غلام آزاد کرانا) یا فقر و فاقہ کے دن کھانا کھلانا، قرابت والے یتیم کو یا بدحال مسکین کو۔ پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے، جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور (انسانوں کے ساتھ) رحمت و شفقت کے سلوک کی تاکید کی۔ یہی لوگ ہیں جو (قیامت کے دن اللہ کے) دائیں جانب ہوں گے اور جنھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ بائیں جانب والے ہیں۔ ان پر چاروں طرف سے آگ بند ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں۔ میں ان میں سے بعض نمایاں احسانات کا

ذکر ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آنکھ، کان اور دل و دماغ کی بے نظیر قوتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ اسے ایک دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔ وہ ہے غلاموں کو آزاد کرانا اور یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایمان والوں میں شامل ہو جائے جو عملاً اس گھاٹی کو طے کر رہے ہیں جن کی زندگیاں اللہ کی راہ میں صبر و استقامت کا ثبوت بھی فراہم کر رہی ہیں اور جو اس کی نصیحت بھی کر رہے ہیں، جن کا رویہ مظلوموں، محکوموں، بھوکوں اور پیاسوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا ہے اور جو اس ہمدردی کی دوسروں کو تلقین و تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ راستہ جنت کا ہے۔ اس کی مخالفت کرنے والے جہنم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اسی میں پہنچیں گے پھر اس کے دروازے اس طرح بند کر دئے جائیں گے کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔

خدمتِ خلق منہاجِ انبیاء ہے

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے بہت سے پیغمبروں اور ان کی تعلیمات کے بکثرت حوالے دیے گئے ہیں۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل کے اسرائیلی پیغمبروں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ان پیغمبروں نے بنی اسرائیل سے انسانوں کے حقوق پہچاننے، ان کی خدمت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔ اس عہد کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ'' (البقرہ: ۲: ۸۳۔۸۴)

''یاد کرو جب ہم نے بنو اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے اور (اسی طرح) قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی (حسن سلوک کرو گے) اور عام لوگوں کے ساتھ اچھی طرح بات کرو گے۔ نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے لیکن سوائے چند ایک کے تم سب اس سے پھر گئے۔ اور یہ بھی یاد کرو کہ ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو گھروں سے نکال کر بے گھر نہ کرو گے۔ پھر تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تم اس کی شہادت بھی دیتے ہو''۔

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل سے ایک تو الہِ واحد کی عبادت اور انسانوں کے ساتھ

حسن سلوک کا عہد لیا گیا تھا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ ان کا دامن ہمیشہ ظلم وزیادتی سے پاک رہے گا۔ حسن سلوک کا ظلم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔ انسانوں کی خدمت کا جذبہ، بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ جو شخص دوسروں کا خون بہاتا پھرے وہ ان کے زخموں کے لیے مرہم نہیں فراہم کرے گا۔ اِسی طرح خدمت کرنے والا ہاتھ جور وستم کے لیے نہیں اٹھے گا۔ یہ مختلف کردار ہیں اور مختلف جذبات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خدمت سے قوموں کی زندگی وابستہ ہے اور ظلم نے بڑی بڑی جابر اور سرکش قوموں کی کمر اس طرح توڑ کر رکھ دی کہ ان میں سے بہت سی قوموں کو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حیات آفریں عہد و پیمان کی قدر نہیں کی۔ اسے توڑتے اور پامال کرتے رہے۔ انہوں نے اللہ کی کتاب کے بعض احکام پر عمل کیا اور بعض کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو قتل کیا، انہیں گھروں سے نکالا اور اس مقصد کے لیے دشمنوں تک سے ساز باز اور ان کی مدد کی۔ اس سے ان کی قوت اور وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ انہیں دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑی اور آخرت کے عذاب میں بھی وہ بری طرح پکڑے جائیں گے۔ (البقرہ:۲:۸۵)

خدمت خلق احادیث کی روشنی میں

مخلوق کی خدمت اللہ کی خدمت ہے

اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خالق کی خدمت سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے کہا اللہ کے بندوں کی مدد کرنا حقیقت میں اللہ کی مدد کرنا ہے۔ ان کے کام آنا اللہ کے کام آنا ہے۔ اگر آپ کے روبرو اللہ کا کوئی بندہ ہاتھ پھیلائے اور آپ اس کا ہاتھ خالی لوٹا دیں تو گویا آپ نے اللہ کے ہاتھ کو خالی لوٹا دیا۔ کوئی مریض آپ کی مدد کا محتاج ہو اور آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو گویا اللہ کی مدد سے انکار کیا۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بندوں کو خوش کیا جائے اور ان کو راحت پہنچائی جائے۔ آسمان والا اپنی رحمتیں اسی وقت نازل کرتا ہے جب زمین والوں پر رحمت وشفقت کا سلوک کیا جائے۔ ایک حدیث میں اسی حقیقت کو بہت ہی مؤثر اور دل نشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان گھبرا کر عرض کرے گا: اے میرے رب! تو سارے جہاں کا پروردگار ہے، تو کب بیمار ہوا تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں گیا۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر خدائے تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا

لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ انسان عرض کرے گا: اے دونوں جہاں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا اور میں تجھے پانی کیسے پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ **(صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة)**

خدمت خلق کی عظمت اور اہمیت کے لیے یہ بات بہت کافی ہے کہ وہ خالق کی خدمت ہے اور اس سے پہلوتہی کرنا خالق کی خدمت سے غفلت کے ہم معنی ہے۔

خدمتِ خلق کا جذبہ ہر حال میں توانا رہنا چاہیے

اسلام یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان اس طرح زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے خیر کے چشمے جاری ہوں۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اور مالی وسائل دوسرے انسانوں کے کام آئیں۔ اپنی حدِّ استطاعت کے اندر وہ ان کی مادی اور اخلاقی مدد کرے۔ وہ گھر سے فتنہ وفساد پھیلاتا ہوا نہ نکلے بلکہ انسانوں کے خیر خواہ اور فلاح بہبود چاہنے والے کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ جہاں بیٹھے امن وسلامتی کا پیغام بکھیرتا رہے، دوسروں کی مشکلات دور کرے اور ان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔

اسلام فرد کو معاشرہ کی ماڈی اور اخلاقی خدمت پر جس طرح ابھارتا اور اس کا جذبہ اس کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوسکتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ایاکم و الجلوس علی الطرقات۔ فقالوا مالنا بد انما ھی مجالسنا نتحدث فیھا۔ قال فاذا ابیتم الا المجالس فاعطوا الطریق حقھا۔ قالوا و ما حق الطریق؟ قال غض البصر و کف

(۱) صحیح بخاری، کتاب المظالم و القصاص، باب افنیة الدور و الجلوس فیھا۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الاسلام، باب من حق الجلوس فی الطریق رد السلام۔

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات۔

(۴) نفس المرجع

الاذی ورد السلام والامر بالمعروف والنھی عن المنکر"(۱)

"راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمارے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے یعنی بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہماری مجلسیں ہیں۔ جن میں ہم بات چیت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے سوال کیا کہ راستہ کا حق کیا ہے؟ ارشاد ہوا نگاہیں نیچی رکھنا، تکلیف دینے سے بچنا، سلام کا جواب دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا"

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بعض اور صحابہؓ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابوطلحہؓ کی روایت میں "سلام کا جواب دینا" کے بعد "حسن کلام" کا ذکر ہے۔(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حدیث کے آخر میں "**ارشاد السبیل**" کا اضافہ ہے۔(۳) اس کے معنی راستہ دکھانے کے ہیں۔ ایک اور روایت میں "**تغیثو الملھون وتھدوا الضال**"(۴) کے الفاظ ملتے ہیں۔ یعنی راستہ میں جہاں تم بیٹھے ہو کسی کو فریاد کرتے دیکھو تو فریاد رسی کرو اور بھٹکنے والے کو راستہ دکھاؤ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ معاشرہ کی طرف سے ایک مومن پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسے راستہ اور بازار میں، مجلسوں اور محفلوں میں ہر جگہ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ دوسروں کی عفت وعصمت کا پاسبان ہے، اسے کسی پر بری نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، وہ دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، اس کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچنی چاہیے۔ جیسے آمدورفت میں رکاوٹ ڈالنا، گندگی پھیلانا، راہ گیروں سے الجھنا اور بدزبانی کرنا وغیرہ۔ راستہ میں ایذا رسانی کی جو بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ان سب سے اس کا دامن پاک ہونا چاہیے تاکہ وہ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کریں۔ پھر یہ کہ وہ جہاں بیٹھے معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے۔ اس سے معاشرہ میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ برائیوں سے محفوظ رہے گا۔ جب کوئی شخص کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ کرے گا اسے محسوس ہوگا کہ سوسائٹی میں اس کا احتساب کرنے کی طاقت موجود ہے۔ راستہ کا یہ بھی حق ہے کہ آدمی بدزبانی اور تلخ کلامی کا مظاہرہ نہ کرے بلکہ اس کے اندازِ تخاطب میں شرافت اور پاکیزگی پائی جائے اور شیریں کلامی کے ساتھ ہر ایک سے پیش آئے۔ اس سے بازار کے بہت سے جھگڑے اور ہنگامے ختم ہو سکتے ہیں۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اور بھٹکنے والوں کو راستہ دکھانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح اسلام نے ترغیب بھی دی اور تاکید بھی کی کہ معاشرہ کا جو فرد بھی کسی کے دکھ درد میں کام آ سکتا ہے ضرور کام آئے۔ وہ بھوکا، پیاسا اور لباس کا محتاج ہے تو اسے کھانا، پانی اور کپڑا فراہم کرے، وہ بے گھر ہے تو اس کی رہائش کا انتظام کرے۔ وہ بیمار ہے تو اس کا علاج اور تیمارداری کرے۔ وہ بے

روزگار ہے تو اسے روزگار سے لگائے۔ وہ جاہل اور ناخواندہ ہے تو اسے علم وحکمت سے آراستہ کرے اور وہ مظلوم ہے تو دوسروں کی چیرہ دستی سے اس کی حفاظت کرے۔ اس جذبہ کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے اس نے ظلم وزیادتی کی مذمت کی، اس کی قباحت واضح کی اور اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی شخص کسی کی کمزوری، ناتوانی، غربت اور جہالت کا استحصال نہ کرے بلکہ اسے نفع پہنچانے اور اس میں جو نقص اور کمی رہ گئی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ اسے کسی تکلیف میں گرفتار دیکھ کر خوشی نہ محسوس کرے بلکہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے اور جن مصائب میں وہ گھرا ہوا ہے ان سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ اس طرح اسلام ایک ایسا معاشرہ فراہم کرتا ہے جس میں ظلم کے خلاف شدید نفرت پائی جائے، اور ہر طرف عدل واحسان کے جذبات کی حکمرانی ہو۔

☆☆☆

تفہیم دین

محمد فتح اللہ گولن

قلب سلیم کیا ہے؟

لفظ سلیم کا ماخذ فعل سَلِم ہے، جو لفظ اسلام کا ماخذ بھی ہے۔ قلب سلیم کا لغوی معنی ہے ایسا دل جو ہر قسم کی بیماری اور عارضہ سے محفوظ ہو۔ تاہم اصطلاح میں اس سے مراد ایسا دل ہے جو اسلام کے سوا کسی چیز سے آشنا نہ ہو۔

قلب سلیم والا بننے کے لیے قرآن کریم میں بیان کردہ مومنانہ اخلاق کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک عمومی تعریف ہے جس میں بہت سے امور داخل ہیں۔ حضرت سعد بن ہشام بن عامر سے مروی ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''اے ام المومنین! مجھے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بتایئے؟'' انہوں نے فرمایا: آپ ﷺ کے اخلاق قرآن (کانمونہ) تھے۔ کیا تم قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ''وَاِ□ نَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ'' (القلم: ۴) ''اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہو۔'' نہیں پڑھتے؟'' قرآن کریم اسی لیے نازل ہوا

تا کہ پہلے رسول اللہ ﷺ اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور پھر آپ ﷺ کی پیروی میں آپ ﷺ کی امت اپنی زندگی، افکار اور تصورات کو اس کے مطابق سنوارے۔ نیز ہم دیکھتے ہیں کہ قلب سلیم دوسروں کو ایذا پہنچانے سے مکمل اجتناب کرنے والا دل ہوتا ہے، کیونکہ حدیث نبوی میں ہے: ''حقیقی مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' اگر چہ یہ مخصوص تعریف ہے لیکن اسے امتیازی حیثیت حاصل ہے، لہذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی انسان کو زبان یا ہاتھ سے ایذا نہ پہنچائے۔

قلب سلیم کا کفر و شرک، شکوک وشبہات اور تذبذب سے پاک ہونا ناگزیر ہے۔ کافر شخص کا رویہ کتنا ہی انسان دوست کیوں نہ ہو اس کا دل قلب سلیم نہیں ہو سکتا۔ آج بہت سے لوگ کہتے ہیں: ''میرا دل صاف ہے، کیونکہ میں انسانوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور ان کی مدد کے لیے تگ و دو کرتا ہوں۔'' لیکن یہ دعوی بالکل بے بنیاد ہے، کیونکہ ایک دل میں کفر و الحاد ہو تو وہ کبھی بھی قلب سلیم نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ اپنے اور کائنات کے مالک کا منکر ہے اور اس کا دل اس انکار سے لبریز ہے۔ انسانیت سے محبت یقینا اچھی اور قابل اہمیت چیز ہے، لیکن ایسا احساس ایمان سے مربوط ہونا چاہیے، ایمان کے بغیر بھلائی، حسن اور فضیلت کی ہر صورت یا تو جھوٹی ہوگی یا عارضی ہوگی، لہذا اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

حالات حاضرہ: انتخابات ۲۰۱۳ء پروفیسر طارق بٹ

نفاذِ اسلام کے دشمن

ہمیں پروفیسر بٹ صاحب کے نہ موقف سے اتفاق ہے نہ ان کے اسلوب سے لیکن ان کا اصرار ہے کہ ہم علماء کرام کے بارے میں جو موقف پیش کرتے ہیں وہ غلط اور یک طرفہ ہے لہذا ان کی رائے میں احقاق حق کا تقاضا ہے کہ ان کا موقف بھی قارئین کے سامنے آئے۔ چنانچہ ہم ان کی تلخی کو برداشت کرتے ہوئے ان کا موقف دے رہے ہیں۔ کچھ یہی حال پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کی تحریر کا ہے۔ مدیر

وہی ہوا جو نظر آ رہا تھا کہ سیاسی مولوی انتخابات میں پِٹ گئے اور سوائے سرحد کے چند سادہ لوح پٹھانوں کے کسی نے ان کو ووٹ نہیں دیے۔ یہ ہر جگہ ہار گئے۔ علماء ہمیں حدیثیں سناتے رہتے ہیں کہ امت محمد یہ اجتماعی طور پر کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتی تو اب پاکستان کی امت اسلامیہ نے اپنی اجتماعی رائے دے دی ہے کہ یہ سیاسی علماء ان کے نزدیک نا قابل اعتماد ہیں اور یہ ان کے نزدیک اسلام کی صحیح نمائندگی

نہیں کرتے۔ اگرچہ ان سب جماعتوں نے اپنے نام کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگایا ہوا ہے لیکن اسلام کی یہ بُگّل مارنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ عوام انہیں سمجھ گئے ہیں اور انہوں نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ یہ لوگ اسلام کے لیے سچے نہیں ہیں اور اسلام کا نام اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ان سیاسی علماء نے اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اسلام ان کے لیے محض کاروبار اور روٹی کمانے کا ذریعہ ہے اور چونکہ یہ اسلام کے سچے نمائندے نہیں ہیں لہذا لوگ انہیں ووٹ نہیں دیتے اور چونکہ یہ خود کو اسلام کا ستون اور محافظ قرار دیتے ہیں اور خود کو پاکستان میں نفاذ شریعت کا علم بردار قرار دیتے ہیں اور کردار ان کا ایسا ہے کہ لوگ ان کو اسلام کے نام پر ووٹ نہیں دیتے۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ پاکستان میں اسلام نافذ نہ ہونے کے ذمہ دار دوسروں سے بڑھ کر یہ سیاسی مولوی ہیں۔ اور یہ ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سیکولر، دہریے اور بے دین لوگوں نے اسلام کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا ان سیاسی مولویوں نے پہنچایا ہے اور یوں یہ اسلام کی علم برداری کے نام پر نفاذِ اسلام کے ہدف سے دشمنی کر رہے ہیں اور اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔

جو چند علماء مسلم لیگ (ن) کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے وہ جیت گئے ہیں۔ اس کا مطلب اِس کے سوا کیا لیا جا سکتا ہے کہ لوگ ان دینی سیاسی جماعتوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کی کارکردگی کو ردّ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اُن سیاسی جماعتوں کو ترجیح دیتے ہیں جو محض سیاسی جماعتیں ہیں اور خود کو اسلامی جماعتیں نہیں کہلاتیں۔ اِس سے ہمارا یہ موقف ثابت ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام میں رکاوٹ دراصل یہ دینی سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر ہیں ورنہ اگر یہی علماء کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائیں تو اس سیاسی جماعت کی وجہ سے جیت جائیں گے اور حکومتی پلیٹ فارم پر اسلام کے حق میں بات بھی کر سکیں گے۔ لیکن ان سیاسی علماء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ انہیں اسلام کا نعرہ لگانے، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے اور اپنی لیڈری سے لطف اندوز ہونے کا چسکا پڑا ہوا ہے اور لوگ خالص دینی معاملات میں ان کی جو قدر و منزلت کرتے ہیں (جیسے نماز پڑھانا، نکاح، جنازے اور ختم وغیرہ پڑھنا) یہ اس کو سیاسی میدان میں کیش کرانا چاہتے ہیں لیکن عرصے سے عوام ان کو سمجھ گئے ہیں اور انہیں ووٹ نہیں دیتے لیکن یہ ڈھیٹ لوگ ہیں اور اپنی بڑائی اور لیڈری کے شوق میں اسلام کا نام استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہاں تک کہ ایک سیاسی مولوی صاحب نے حالیہ انتخابات میں اپنے ایک

سیاسی مخالف کے خلاف ''فتویٰ'' دے دیا کہ اسے ووٹ دینا شرعاً حرام ہے۔ سوال یہ ہے کہ خود ان کے اس فتوے کی ''شرعی'' حیثیت کیا ہے؟ اور فتویٰ جیسے شرعی معاملے (Tool) کا اپنے ذاتی مفادات کے لیے یہ استعمال کتنا سطحی، جانبدارانہ بلکہ کریہہ ہے۔ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا حرکت میں آئے اور ان سیاسی مولویوں کو دنیا ہی میں سزا مل جائے (اگرچہ فیصلے کا میدان قیامت ہی کو سجے گا) اور کوئی سرپھرا سیاستدان دین کے نام پر سیاست چمکانے والی ان جماعتوں پر پابندی لگا دے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو ظاہر ہے اس کے ذمہ دار بھی یہ سیاسی مولوی ہی ہوں گے جو اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن ان میں اتنا اخلاص نہیں کہ اسلام کے نام پر اور نفاذِ اسلام کے کسی پروگرام پر اکٹھے ہو جائیں بلکہ ان کو اپنا فرقہ اور اپنی لیڈری ہر قیمت پر مطلوب ہے خواہ اسلام کا جتنا بھی نقصان ہو جائے۔

معاف کیجیے گا! ان حالات میں اگر بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان سیاسی مولویوں سے تو وہ دنیا دار سیاستدان اچھے ہیں جو اپنی عقل سمجھ کے مطابق دین کی خدمت کو سعادت سمجھتے ہیں، تو کیا غلط کہتے ہیں؟ جیسے لیاقت علی خاں نے قرار داد مقاصد پاس کرائی، بھٹو نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا، شراب خانے اور نائٹ کلب بند کرائے، ضیاء الحق نے حدود نافذ کرائیں، نماز اور شلوار قمیض کو رواج دیا۔ نواز

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِ اعانت سالانہ 400 روپے　　　تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ و طالبات کے لیے　　　250 روپے سالانہ

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ B-369، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

شریف نے شریعت بل پاس کرایا۔۔۔۔اور یہ سب داڑھی منڈے اور بظاہر غیر مذہبی لوگ تھے۔لیکن ان سیاسی مولویوں کا کردار کیا رہا؟ کوئی ڈیزل کے پرمٹ لے کر بیچتا رہا، کسی کے طوائفوں کے ساتھ فوٹو چھپے، کسی نے فوجی جرنیلوں سے پیسے لے کر انتخابی مہمیں چلائیں، کسی نے جہاد کا 'کاروبار' شروع کیا اور بہت سے لوگ اقتدار اور جھنڈے والی گاڑی کے تعاقب میں رہے حکومت خواہ کسی کی بھی ہو۔لوگ ان کے کردار کو دیکھ کر اگر ووٹ نہیں دیتے تو اس میں لوگوں کا کیا قصور ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ وہ غیر سیاسی علماء بھی اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں جو سچے اور مخلص ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بخاری اور مسلم کا درس دے دیا، جمعہ کا وعظ کہہ دیا، لوگوں کو نماز پڑھا دی تو انہوں نے دین کا حق ادا کر دیا؟ نہیں! ان کا قصور یہ ہے کہ وہ ان سیاسی مولویوں کا محاسبہ نہیں کرتے، ان کا ہاتھ نہیں پکڑتے اور جب یہ سیاسی مولوی ان کو 'تحفظ مدارس' اور 'تحفظ مسلک' کے نام پر بلیک میل کرتے ہیں تو وہ ان کا کچا چٹھا ان کے منہ پر نہیں دے مارتے؟ جب تک یہ غیر سیاسی علما، خاص کر اِن کے سینئر اور بڑے لوگ، جمع ہو کر ان سیاسی مولویوں کی اصلاح کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ بھی عنداللہ اور عند الناس اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں اور ان سیاسی مولویوں کے گناہوں میں برابر کے شریک ہیں۔

*ڈائریکٹر الفوز انٹرنیشنل گرلز کالج، جوہر آباد

حالاتِ حاضرہ: انتخابات ۲۰۱۳ء

پروفیسر ملک محمد حسین*

اسلامسٹوں کے مفاداتی گروہ

اسلام اور نظریۂ پاکستان کے حوالے سے وطنِ عزیز سخت کنفیوژن کا شکار کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف سیکولرسٹ اور لبرالسٹ لابیاں ہیں جو پاکستان کے اساسی نظریے کے طور پر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی نفی کرتی ہیں۔ قائداعظمؒ کے ۱۱ اگست کے مبینہ خطاب کی بنیاد پر بانیٔ پاکستان کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے اور پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی اصطلاح جماعت اسلامی کی ایجاد ہے جسے جنرل یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں جنرل شیر علی خان نے آگے بڑھایا۔ سیکولرسٹ لابی کے چند معروف صحافی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان کی تحریک آزادی یا آزادی کے بعد ابتدائی سالوں میں نظریۂ پاکستان کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ڈاکٹر صفدر محمود جو تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان بشمول پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ کے ایک چوٹی کے محقق ہیں ڈنکے کی چوٹ پر ہی نہیں مستند تاریخی حوالوں سے بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے اپنی پوری زندگی میں سیکولرزم یا سیکولر خیالات کا کبھی ذکر تک نہیں کیا اور یہ کہ متعدد بار بانیٔ پاکستان نے اسلامک آئیڈیالوجی اور پاکستانی آئیڈیالوجی کا اظہار فرمایا۔ بہرحال یہ کنفیوژن تو ایسی ہے جس کا تاریخی حوالوں سے توڑ کیا جا سکتا ہے اور محققین کر بھی رہے ہیں لیکن جو کنفیوژن دوسری طرف نام نہاد اسلامسٹوں نے پھیلایا ہوا ہے اس کا مداوا ہوتا کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم مسلمانوں اور اسلام کے سچے پرستاروں کی بجائے اسلامسٹوں کی اصطلاح دانستہ طور پر استعمال کر رہے ہیں تاکہ اسلام کے سچے اور مخلص پیروکاروں اور اسلام کے مفاداتی دعوے داروں کے درمیان فرق قائم رکھا جا سکے۔ اسلامسٹوں نے مسلمانوں کو پہلے درجے پر سُنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، مقلد اور غیر مقلد گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے جب کہ دوسرے درجے پر سُنیوں کو اہل سنت والجماعت، سنی تحریک، سنی اتحاد کونسل۔ شیعوں کو پاکستان اسلامی تحریک، مجلس اتحاد المسلمین اور اسی طرح کے دیگر گروہ۔ دیوبندیوں کو فضل الرحمن گروپ، نظریاتی گروپ، سمیع الحق گروپ، جمعیت اشاعت التوحید والسنہ، تبلیغی جماعت وغیرہ۔ اہل حدیثوں نے بھی اپنے آپ کو تین چار گروہوں میں اور اسی طرح جمعیتوں کے نام جمعیت علماء پاکستان، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء حدیث وغیرہ وغیرہ گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان گروہوں کی تہہ تک اگر جانے کی کوشش کی جائے تو شاید سُنی حضرات اور شیعہ حضرات میں کچھ فروعی قسم کا فرق ہو۔ اسی طرح شاید اہل حدیث حضرات بھی کسی نہ کسی پہلو سے کچھ مسلکی اختلاف ثابت کر سکیں۔ جب کہ اسلامسٹوں کے تمام کے تمام گروہ محض مفادات اور دنیاوی اغراض کی بنیاد پر گروہ بندی کا شکار ہیں۔ ان کی گروہ بندی اور گروہی اختلافات کا قرآن وحدیث

کے حوالے سے کوئی جواز نہیں بنتا۔ تمام گروہوں کے لیڈروں نے اپنے اپنے مقلدین، مقتدیین اور تابعین کو قرآن و حدیث کی من مانی تشریحات کر کے اپنے ساتھ باندھ رکھا ہوتا ہے اور اپنی سحر انگیز خطابت سے اُن بیچاروں کے اذہان کو اس طرح قابو کیا ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتے۔

عوام الناس میں اور خاص طور پر اسلامی ذہن کے سادہ منش لوگوں میں ان اسلامسٹوں کے پھیلائے ہوئے مفاداتی جال سے جو کنفیوژن پھیلتا ہے وہ حد درجہ ضرر رساں اور قومی یک جہتی کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اسلامسٹوں کا یہ تباہ کن کنفیوژن قومی انتخابات کے موقع پر اپنا پورا جوبن دکھاتا ہے۔ ایک تو اسلام کا نام لے کر ہر حلقے میں بہت سے لوگ انتخابات میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور انتخابات میں سیکولرسٹوں اور نام نہاد لبرل امیدواروں کی بجائے ایک دوسرے کے کپڑے اتارتے ہیں جس کے نتیجے میں چند سو یا چند ہزار ووٹ لے کر اس تاثر کو پھیلانے کا باعث بنتے ہیں کہ عوام الناس اسلام کے نام پر ووٹ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ ان اسلامسٹوں کے مفاداتی اور غیر حکیمانہ رویوں سے ایک طرف یہ صورت حال سامنے آتی ہے اور دوسری طرف جو صورت حال ہے وہ ایک بڑے قومی ادارے کے سروے سے سامنے آئی ہے جس کے مطابق پاکستان کے ۸۴ فیصد نوجوان لوگ ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے خواہاں ہیں۔ نفاذِ شریعت کے حامی ۸۴ فیصد لوگ اگر بروئے کار نہیں آتے یا نہیں آسکتے تو اس کی واحد وجہ وہ کنفیوژن ہے جو اسلامسٹوں کے مفاداتی گروہوں نے پھیلا رکھی ہے۔ ان اسلامسٹوں کے سرخیل وہ فرقہ پرست اور مفاد پرست علماء کرام ہیں جنہیں قیامت کے روز اللہ کے ہاں جواب دہی کا احساس ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یہ احساس ناپید ہے۔ ان فرقہ پرست اور مفاد پرست علماء حضرات کے اساتذہ کرام کو جن کے علم و فضل کا چراغ چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور جن کا اسلام کے ساتھ خلوص، للّٰہیت اور تقوی کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے اور جن کا تعلق بنیادی طور پر مدرسہ حقانیہ، جامعہ خیر المدارس، جامعہ بنوریہ، جامعہ نعیمیہ، جامعہ حزب الاحناف، جامعہ المنتظر، جامعہ اشرفیہ وغیرہ وغیرہ سے ہے، اپنے آپ کو روبہ عمل آنا چاہیے اور فرقہ واریت اور مفادات واغراضِ دنیاوی پر مبنی اہل اسلام کی گروہ بندی کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ ملی مجلس شرعی اور اس طرح کے بعض ڈھیلے ڈھالے ادارے موجود ہیں جو اس ضمن میں مثبت کام کر رہے ہیں لیکن شاید ان کی پورے ملک میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں لاکھوں شاگردوں پر گرفت مضبوط نہیں ہے اس لیے فرقہ واریت کا شر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ مسلمانوں کی باگ ڈور بہر حال علماء کرام کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی قوت کا مرکز مسجد ہے۔ اگر تمام علماء کرام اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں اور اپنی ذاتی اغراض اور گروہی سیاسی مفادات سے کنارہ کشی کر لیں تو وطنِ عزیز میں کسی کو لبرلزم اور سیکولرزم کا نام لینے کی بھی جرأت نہ ہوگی، انشاء اللہ۔

سیّد خالد جامعی ☆

☆ [illegible] کراچی

جدید سائنس کے ناقدانہ مطالعے کی ضرورت (آخری قسط)

ماہنامہ 'ساحل' ایک علمی و تحقیقی رسالہ ہے جس میں مختلف عنوانات پر مقالات اور بہت اہم مباحث کے حق میں اور خلاف تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر تحریروں پر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ اس کے باعث محمد رشید صاحب کو التباس ہوا کہ یہ تمام تحریریں راقم الحروف کی ہیں۔ محمد رشید صاحب نے ''**جدیدیت، عهد حاضر اور اسلام**'' کے نام سے راقم کے مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ 'ساحل' کے کسی شمارے میں یہ مضمون نہ راقم کے نام سے شائع ہوا نہ ہی بغیر نام کے اس کی اشاعت ہوئی۔ یہ مضمون انہوں نے کہاں سے لیا اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ موصوف نے راقم کی کسی ایسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جو راقم کے نام سے 'ساحل' میں یا 'ساحل' کے سوا کسی اور رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ راقم کا موقف آج بھی یہی ہے کہ سائنس اور جدید سائنس ٹیکنالوجی، ٹیکنو سائنس میں فرق ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ امت سائنس و ٹیکنالوجی ترک کر دے۔ جدید سائنس پر تنقید کو تکفیر سمجھنا درست رویہ نہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ جدید سائنس و ٹیکنو سائنس پر ایمان بالغیب کی ضرورت نہیں، اس کا بے رحمانہ ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ غیر اقداری ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن دنیا کے جس معاشرے میں پہنچتی ہے وہاں کی اقدار بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارے اصل مخاطب وہ لوگ نہیں جو اس علم کی مصنوعات استعمال کرتے ہیں بلکہ ہمارے مخاطب وہ اہل علم ہیں جو جدید سائنس کی اسلام کاری کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسے قرآن وسنت سے ثابت کر رہے ہیں لہٰذا سائنس، جدید سائنس، عہد قدیم کی سائنس، ازمنۂ وسطیٰ کی سائنس، ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس و سائنٹزم کے فرق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

'ساحل' میں شائع ہونے والی ان مختلف النوع اور متضاد نقطۂ نظر کی حامل تحریروں کا مقصد عہد جدید کے پیدا کردہ اہم موضوعات، علوم اور ان کے پیدا کردہ سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے۔ ان اہم موضوعات میں سے اہم ترین موضوع جدید سائنس [Modren Science] فلسفۂ سائنس، فلسفۂ ٹیکنالوجی، ٹیکنو سائنس، سائنسٹزم وغیرہ بھی ہیں۔ ان موضوعات پر ساحل میں سالہا سال سے جدید سائنس کے حق میں اور مخالفت میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ اتفاقاً جناب محمد رشید صاحب کی نظر سے تمام

مضامین خصوصاً وہ مضامین جو سائنس کی حمایت میں اور اسلام اور سائنس میں ہم آہنگی کے حوالے سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، نہیں گزر سکے ورنہ وہ راقم الحروف پر یہ الزام بھی عائد کر دیتے کہ سید خالد جامعی صاحب جدید سائنس کے حامی بھی ہیں بلکہ وہ اسلام کو جدید سائنس سے ثابت بھی کرتے ہیں مثلاً مارچ ۱۹۹۸ء کے 'ساحل' میں ایک تحریر ''اسلام کا تولیدی نظام، اسلام اور سائنس کی روشنی میں'' شائع ہوئی۔ ایک مضمون جون ۱۹۹۸ء میں ''کیا سائنس اور اسلام کے درمیان تضاد ہے؟'' کے نام سے شائع ہوا۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں ایک مضمون ''قرآن میں ماحولیات کا تصور'' ماحولیاتی سائنس [Enviormental Science] کے حوالے سے شائع ہوا۔ دسمبر ۱۹۹۹ء میں ایک مضمون ''قرآن کا تصور علم۔ جدید علوم سائنس وٹیکنالوجی کی اسلامائزیشن کی ضرورت'' شائع ہوا۔ ظاہر ہے ان تحریروں اور مضامین کو راقم کے نامۂ اعمال میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا مضمون ''اسلامی تحقیق کا مدعا، مفہوم اور طریق کار'' بھی شائع ہوا اور اس پر تنقید بھی شائع ہوئی۔ ہندوستان و پاکستان کی مذہبی فکر کا تنقیدی جائزہ بھی شائع ہوا اور اس جائزے کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا۔ تحریکات جہاد کے خلاف وحیدالدین خان، جاوید غامدی جیسے مغربی متاثرین کے تبصرے بھی شائع ہوئے اور ان کا رد بھی لکھا گیا۔ حجرۂ نبوی کے اندر نقش عربی نعتوں اور نعت نگاری کی روایت پر مضامین بھی لکھے گئے اور نعت خوانی کے ذریعے جدیدیت کے فروغ کی کوششوں کا بھی جائزہ شائع ہوا اور اویس قادری وغیرہ کی جدید نعت خوانی پر رائے بریلی سے دیے گئے تنقیدی فتوے بھی شائع کیے گئے۔ سرسید پر تنقید بھی شائع ہوئی اور ان کے دفاع میں لکھے گئے مضمون کو بھی جگہ دی گئی۔ 'ساحل' کسی فرد کا نام نہیں، یہ ایک علمی تحریک ہے جس کا مقصد جدیدیت کے پیدا کردہ شبہات اور سوالات کا منہج اہل سنت کی روشنی میں علمی جواب مہیا کرنا ہے، جس کا مقصد عالم اسلام پر مغرب کی فکری، علمی، ثقافتی یلغار کا اسلامی علمیت کی روشنی میں موثر ترین دفاع ہے۔ 'ساحل' کسی فرد کی پرستش یا کسی خاص شخصیت کا بت تراشنے کے لیے شائع نہیں کیا جاتا۔ الحمدللہ تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے اہل درد، اہل علم اور اہل تخلیق کا علمی تعاون وسرپرستی اسے حاصل ہے۔ 'ساحل' علماء کا خادم ہے اور مدارس ومساجد کا تحفظ اور علماء کرام کی معاونت اس کا بنیادی فریضہ ہے کیونکہ رسالت مآب ﷺ کے علم کے وارث علماء کرام ہیں۔ معاشرے میں علماء کرام کا اثر ونفوذ جس قدر زیادہ ہوگا معاشرہ کی اسلامی روایت برقرار رہے گی۔ اگر مساجد ومدارس، اسلامی روایات اور اسلامی علمیت کمزور ہوں تو معاشرہ اسلامی نہیں رہ سکے گا لہٰذا 'ساحل' مغرب کی علمی یلغار کے بارے میں علماء

کرام کو مضامین کے ذریعے آگاہ کرتا ہے۔ یہ پاکستان کا واحد رسالہ ہے جس کی قیمت سب سے کم ہے لیکن جس کے اندر ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ کا قیمتی لوازمہ پیش کیا جاتا ہے جسے مختلف اہل علم تحریر کرتے ہیں۔ ان تحریروں کا مقصد علماء کرام کے لیے کم سے کم وقت اور کم سے کم قیمت میں جدیدیت کی یلغار سے واقفیت کے سوا کچھ نہیں۔

'ساحل' میں جاوید احمد غامدی صاحب کے حق میں مضامین بھی بغیر نام کے شائع ہوئے، سنت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بھی شائع کیا گیا، ان پر تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے لیکن اسی 'ساحل' میں جناب جاوید غامدی صاحب پر چار خصوصی شمارے شائع ہوئے جن میں ان کی عربی دانی ان کے سیماب صفت علمی رویے، ان کے سرقوں کی پوری تاریخ تحریر کی گئی۔ 'ساحل' کے یہ شمارے اب تاریخ کا حصہ ہیں جناب غامدی صاحب کسی ایک رسالے کا بھی جواب نہیں دے سکے۔ 'ساحل' نے اپریل ۲۰۰۶ء میں پہلا شمارہ شائع کرنے کے بعد ان کو دعوت دی کہ ساحل کے اگلے شمارے میں وہ اپنا موقف بیان کریں پورا شمارہ انہی کے موقف پر مشتمل ہوگا لیکن انھوں نے دفاع کرنے کے بجائے دوسطری خط میں صرف یہ لکھا کہ آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کررہا ہوں فیصلہ تاریخ کرے گی۔ 'ساحل' کے ان چار رسالوں کا اثر یہ تھا کہ غامدی صاحب نے اپنی عربی ویب سائٹ بند کردی جو آج تک نہیں کھولی گئی۔ اس ویب سائٹ پر غلط سلط عربی عبارتیں ان کے مکتب فکر کی عربی دانی کی قلعی کھول دیتی ہیں۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''مقامات'' بازار سے غائب کرادی۔ مقامات کے تین حصے تھے: ایک اردو، ایک عربی، ایک انگریزی۔ ڈاکٹر رضوان ندوی صاحب نے ''مقامات'' عربی حصے میں چھ سو اغلاط کی نشان دہی کی۔ 'ساحل' نے غامدی صاحب کی انگریزی شاعری میں سرقہ زدہ مصرعوں کی نشاندہی کی لہٰذا اس کتاب کو بازار سے غائب کرانے کے بعد مقامات کے نام سے نئی کتاب صرف اردو زبان میں شائع کی گئی، اس پر لکھا گیا 'اشاعت اوّل' اور سن اشاعت ۲۰۰۸ء تحریر کیا گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کے اندر غامدی صاحب کا ۲۰۰۷ء کا ایک مضمون ''روداد سفر'' شامل ہے جس میں اپنی طبع شدہ تصانیف کی فہرست میں انھوں نے ''مقامات'' کو شامل کیا ہے [ص ۲۸ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ اگر مقامات ۲۰۰۷ء سے پہلے شائع ہو چکی تھی تو اس پر اشاعت اول اور ۲۰۰۸ء کیسے درج ہے؟

'ساحل' ہمیشہ مدارس، علماء، دینی قوتوں، دینی تحریکوں کا محافظ اور نگہبان رہا ہے۔ دسمبر ۲۰۰۰ء میں پرویز مشرف حکومت نے مدارس عربیہ کے لیے جامعہ از ہر سے رہنمائی کے ذریعے ان کے کردار اور طریقۂ تعلیم کو بدلنے اور مدارس کی ثقافت کو مکمل تبدیل کرنے کی منصوبہ بندی کی تو سا'حل' نے دسمبر ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی۔

جہاد افغانستان، علماء کرام اور مدارس دینیہ کے تحفظ کے سلسلے میں 'ساحل' میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:

جون ۲۰۰۰ء دینی تحریکیں، دینی جماعتیں، دینی قیادت آج بھی سب سے موثر ترین قوت۔ دینی قوتوں کا ووٹ بینک کم زور نہیں ہے 'ساحل'، اگست ستمبر ۲۰۰۱ء (۱) حضرت والا مفتی تقی عثمانی کا تاریخی فتویٰ مسلمان عمرے کے بجائے اپنے افغان بھائیوں کی مدد کریں (۲) دہشت گردی کے خلاف دہشت گردوں کا اتحاد (۳) روس چین امریکہ و مغرب کروڑوں انسانوں کو قتل کر چکے ہیں (۴) اسلام میں اقدامی و دفاعی جہاد اور حضرت والا مفتی تقی عثمانی۔ دہشت گرد کون امریکہ یا مسلمان؟ (۵) ملا عمر کی پاکستانی علماء سے گفتگو۔ پاکستانی علماء نے ملا عمر کے دلائل سے اتفاق کیا اور امریکہ کے خلاف جہاد کی حمایت کا اعلان کیا 'ساحل' نومبر ۲۰۰۱ء (۶) امریکی دہشت گردی کے خلاف جامعہ اشرفیہ کا تاریخی فتویٰ (۷) آخر طالبان کیوں نہیں جھکے؟ (۸) کیا طالبانِ افغانستان کی حکمت عملی غلط تھی؟ (۹) افغانستان پر امریکی حملہ ریاستی دہشت گردی ہے، مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس جہاد میں افغانستان کو جس قسم کی مدد پہنچانا جس کے لیے ممکن ہو وہ اس سے دریغ نہ کرے۔ بریلوی، دیو بندی، اہل حدیث اور اہل تشیع مکاتب فکر اور اسلامی تحریکوں جماعت اسلامی، جمعیت العلماء پاکستان، جمعیت العلماء اسلام، مرکزی جمعیت اہل حدیث وغیرہ کا متفقہ فتویٰ۔ (۱۰) طالبان یا امریکہ تیسرا راستہ کوئی نہیں 'ساحل' اگست ۲۰۰۶ء (۱۱) دینی تحریکوں میں رابطہ کی ضرورت، حکمت عملی، کسی دینی کام یا دینی تحریک کو رقیب و حریف نہ سمجھئے۔ 'ساحل' دسمبر ۲۰۰۵ء (۱۲) 'علمائے کرام کی خدمت میں چند اہم گزارشات'۔ 'ساحل' مارچ ۲۰۰۶ء (۱۳) تمام مکاتب فکر کے علمی و تحقیقی رسالوں کی کہکشاں، 'ساحل' ستمبر ۲۰۰۵ء (۱۴) 'امت کے نگہبان پاکستانی مدرسے اصل ہدف' نومبر ۲۰۰۰ء (۱۵) امریکا کے خلاف ممتاز بریلوی عالم مفتی رفیق الحسنی کا فتویٰ۔ (یہ فتویٰ افغانستان پر حملے سے ایک سال پہلے جاری کیا گیا تھا)۔ 'ساحل'

فروری ۲۰۰۰ء (۱۶) مدرسوں کی حفاظت خون کے آخری قطرے تک، 'ساحل' مئی ۲۰۰۵ء (۱۷) خصوصی شمارہ دینی مدارس اور سرکاری جامعات کے علمی و اخلاقی معیار کا تقابلی جائزہ، ایک مفصل تجزیہ (۱۸) دینی مدارس کی عمدہ اخلاقی صورت حال ۔ مدارس دینیہ اور سیکولر جامعات کے تقابلی مطالعے کے ذریعے بتایا گیا کہ علم، تحقیق، اخلاق، تہذیب، امن وامان، نظم وضبط اور ادب ہر اعتبار سے دینی مدارس کا پلہ اپنے زوال کے باوجود ان سیکولر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مقابلے میں کئی گنا بھاری ہے جن پر پاکستانی حکومت اربوں روپے خرچ کرتی ہے۔ یہ مضمون پاکستان و ہند کے کئی دینی رسائل میں نقل ہوا۔

'ساحل' دسمبر ۲۰۰۶ء کے سرورق کی پشت پر فنون لطیفہ اور اسلام کے نام سے شبلی نعمانی کی موسیقی وفنون لطیفہ سے دلچسپی کے ایک واقعے کی اشاعت پر جناب محمد رشید صاحب نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا ہے حالانکہ یہ واقعہ 'ساحل' نے ذکر آزاد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے صفحہ ۲۱۷۔۲۱۹ سے من وعن نقل کیا ہے۔ اگر اس واقعے میں فی الواقع کوئی سوقیانہ، عامیانہ بات نظر آ رہی ہے تو اس کے راوی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولانا آزاد پر غصہ اتارنے کی جرأت نہیں تو غصہ 'ساحل' پر اتارا گیا ہے۔ شبلی کے خطوط جو اُن کے انتقال کے بعد مولانا سلیمان ندویؒ نے شائع کیے جن میں عطیہ فیضی سے مولانا شبلی کی دلچسپی اور مولانا آزاد اور مولانا شبلی کے مابین بعض ناگفتہ بہ امور پر خط وکتابت من وعن شائع کی گئی۔ ظاہر ہے مولانا آزاد نے اپنے خطوط اشاعت کے لیے دیے اور مولانا سلیمان ندوی نے یہ خطوط شائع کیے۔ ان خطوط کی بنیاد پر اگر کوئی تنقیدی مضمون 'ساحل' میں شائع ہوا تو اس پر غصے کا کیا جواز۔ غصہ تو مولانا شبلی یا ان کے شاگرد سلیمان ندوی یا ان کے رفیقِ حبیب مولانا آزاد پر نکالنا چاہیے جنہوں نے شبلی کی ناقابل بیان باتوں کو محفوظ کر دیا۔ اس زود حسی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ مولانا شبلی کا ندوہ سے اخراج۔ ندوہ کے طلباء کی ہڑتال۔ اس ہڑتال کی الہلال کی جانب سے حمایت اور ہڑتال کی حمایت میں شبلی کے قلم سے مولانا عبدلسلام ندوی کے نام سے ہڑتال کی حمایت میں مضامین اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ ہم اس تلخ تاریخ کو موضوع بحث نہیں بنانا چاہتے لیکن ایک علمی رسالے میں اگر کبھی کوئی تاریخی موضوع شائع ہو جائے تو اس پر غصے اور برہمی کا اظہار، تحمل کی روایت کے منافی رویہ ہے۔

☆☆☆

ایمان میری زندگی

اسلام آباد میں 10 روزہ تزکیہ و تعلیم کیمپ

از 28 جون تا 7 جولائی 2013ء

☆ قرآن مجید کے اجتماعی مطالعہ کی ایمان افروز مجالس

☆ دین کی جامع تعلیمات پر مشتمل فکر انگیز محاضرات

☆ علمی و فکری راہنمائی کے لئے مذاکرے/سوالات سیشن

☆ شائقین مطالعہ کے لئے ہزاروں کتب پر مشتمل لائبریری

☆ ایک روزہ تفریحی دورہ (مارگلہ کی پہاڑیوں کی کوہ پیمائی)

☆ روح پرور قیام اللیل، تجوید و ترتیل، ادعیہ و اذکار، سنت و حدیث، مطالعہ لٹریچر کے متفرق پروگرام

نوجوانوں کو شرکت کی خصوصی دعوت

ادارے کی طرف سے قیام و طعام کا اہتمام ہوگا، بستر لانے کی ضرورت نہیں ہے

بہترین استفادے کے لئے اپنا ذاتی قران مجید، قلم اور نوٹ بک ساتھ لے کر آئیں

دارالایمان میں اجتماعی اعتکاف کے خواہشمند حضرات بھی رجسٹریشن کے لئے رجوع کریں

دارالایمان، جامع مسجد قرطبہ، E-11/2 اسلام آباد

رابطہ: زاہد اقبال 0300-5300600، جاوید اقبال 0321-5128269،

رضوان اصغر بٹ 0334-5498788، مولانا محمد ریاض 0300-5929247

برائے آن لائن رجسٹریشن www.darul-iman.org

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

توکل کرنا سیکھیے

س: توکل کی تعریف کیا ہے؟

ج: توکل نام ہے اپنی بجائے اللہ پر بھروسہ کرنے کا یا یوں کہہ لیں کہ خود کو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کر دینا اور اس پر مطمئن رہنا توکل ہے۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ توکل سے یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کوشش و عمل ترک کر کے محض اللہ کی مدد اور فضل کی امید پر بیٹھا رہے کیا یہ رویہ درست ہے؟

ج: ہرگز نہیں۔ اس رویے میں ایک طرح کا تکبر پوشیدہ ہے۔ ایسے لوگ اللہ پر اپنا حق جتاتے ہیں جو بالکل باطل ہے۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیدا کردہ تمام ممکنہ اسباب کو اختیار کرے اور پھر نتائج کو اللہ پر چھوڑ دے۔ جو نتیجہ بھی نکلے اس سے بددل نہ ہو اور اس رویے کو مرتے دم تک برقرار رکھے۔ توکل کا یہ مفہوم تھوڑی ہے کہ آدمی اللہ پر بوجھ بن جائے یا اسے معاذ اللہ امتحان میں ڈالے رہے۔

س: کیا توکل میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ بندہ اپنے نفع و نقصان وغیرہ کو اللہ کی طرف سے سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا؟

ج: بالکل، یہ چیز تو توکل کی روح ہے۔ متوکل آدمی کوشش بھی دعا کی طرح کرتا ہے اور اس کی قبولیت کی کسی خاص شکل پر اصرار نہیں کرتا۔ عمل جس احتیاج سے پیدا ہوتا ہے وہ احتیاج بندگی کا خلاصہ ہے۔ خود کو عمل سے مستغنیٰ کر کے آدمی بندہ کہلانے کے لائق نہیں رہتا۔ بندگی کے جتنے بھی فضائل ہیں وہ سب عمل سے اور عمل کے بعد حاصل ہوتے ہیں خواہ یہ عمل دینی ہو یا دنیاوی۔ توکل کو بھی اس پر قیاس کریں اور اچھی طرح جان لیں کہ توکل اسی بندگی کی ایک صفت ہے جس کا جوہر مجاہدہ اور محتاجی ہے۔ جوہر کو منہا کر کے کسی شے کے وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔

س: متوکل بننے کے راستے میں کون سی رکاوٹیں آج کے مسلمان کو درپیش ہیں؟

ج: تمام ضروریات بندگی میں نقص و کمال کا ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے اللہ سے تعلق۔ یہ تعلق مضبوط

ہےتو بندگی مجموعی طور پر کامل ہے اور اگر یہی کمزور ہے تو بندگی کا ہر پہلو ناقص ہے تاہم ہر فضیلت اپنا ایک ذاتی رنگ بھی رکھتی ہے لہٰذا اس کے مواقع اور محرکات کا رنگ سے بھی تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے توکل سے محرومی یا اس میں کمزوری کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

-حبّ دنیا
- تکبر
- ریا اور مخلوق پر بھروسہ
- طول امل

ان میں سے اس معاملے میں ہر ایک کے کردار کی ضروری تفصیل یہ ہے:

حب دنیا

توکل کے لئے حب دنیا زہر ہے۔ نفس کی جو خرابیاں بندے کو توکل بلکہ تعلق باللہ کی تمام صورتوں سے محروم کر دیتی ہیں حب دنیا ان میں سے ایک ہے۔ توکل کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے اللہ سے اپنے تعلق کی بہتری اور مضبوطی مطلوب ہے، اپنی مرضی اور خواہش پر چلنا مطلوب نہیں۔ دنیا کی محبت اس کے منافی ہے۔ یہ دنیا کو خدا سے بڑھ کر مطلوب بنا دیتی ہے اور اس شدت طلب میں جو چیزیں سب سے پہلے متاثر ہوتی ہیں توکل ان میں سے ایک ہے۔ غور سے دیکھیں تو بندگی کے دیگر ضروری فضائل کی طرح توکل بھی بندے اور مالک کے تعلق کی فطری طور پر متوازن صورت کا نام ہے۔ دنیا اس توازن میں یقیناً ایک کردار رکھتی ہے لیکن اس کی حیثیت اصولی طور پر اس احتیاج کو تقویت دینے والے عنصر کی ہے جو عبودیت کی روح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں رہ کر بندے کو اپنے پروردگار اور حاجت روا پر اس بھروسے کا بھی ناگزیر طور پر ثبوت دینا پڑتا ہے جس کے بغیر بندگی محض ایک جبر کا نام تو ہو سکتی ہے مگر اس طاقت اور اختیار کی حاصل نہیں بن سکتی جو احتیاج ہی کی طرح اسے حقیقی اور بامعنی بنا سکے۔ بالفاظ دیگر بندگی جس حاجت مندی، اعتماد اور اختیار سے عبارت ہے، توکل اس کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ دوسری طرف دنیا ہماری ضرورت بھی ہے اور ہمیں طبعاً مرعوب بھی ہے۔ ضرورت اور رغبت کی یکجائی ادنیٰ کو کسی اور تعلق کی شرائط ملحوظ رکھنے سے روک سکتی ہے یعنی دنیا کا ضروری اور مرغوب ہو جانا تعلق باللہ کی ایک ضروری شرط تسلیم و انقیاد کو اس طرح متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہے کہ ہم اس تعلق کے اساسی تقاضے یعنی لامطلوب ولامقصود الا اللہ کو ابتدائی طور پر ہی پیش نظر رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ دنیا ایک پہلو سے اللہ کی نعمت تو ہے مگر اس کی محبت اسے اللہ کا بدل بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حب دنیا اور شرک یا کفر ہم معنی

چیزیں ہیں اللہ سے دور لے جانے کی جتنی صلاحیت حبّ دنیا میں پائی جاتی ہے اتنی شرک اصطلاحی میں بھی نہیں۔ شرک پھر بھر مجودیت کے تصور کو بگاڑ کے ساتھ ہی سہی مگر محفوظ رکھتا ہے حب دنیا میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی۔

سادہ لفظوں میں یوں سمجھیں کہ نفس انسانی اپنی محبوب ومطلوب چیز کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اس تک رسائی یا نارسائی کے تمام احوال خود تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور ان میں کسی کی نسبت یا مداخلت پسند نہیں کرتا۔ دنیا کی محبت اگر پیدا ہو جائے تو یہ صورت لازماً پیش آتی ہے کہ آدمی اس کے سلسلے میں کامیاب ہو یا ناکام، خود مختار اور خود مکتفی رہنا چاہتا ہے۔ اللہ کا حکم، مرضی اور قدرت اس تمنا کے راستے میں رکاوٹوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔

تکبر

تکبر یہاں اپنے معروف معنی یعنی حق کو جانتے بوجھتے قبول نہ کرنا اور دوسرے کو حقیر جاننا کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور گھمنڈ کے مفہوم میں بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا آدھا توکل احتیاج الی اللہ ہے اور بقیہ آدھا اعتماد علی اللہ۔ متکبر آدمی ان دونوں سے مکمل محرومی کا نمونہ ہوتا ہے۔ کامیابی ہو یا ناکامی، تکلیف ہو یا راحت ایسا شخص ہر صورت حال میں اپنی مرکزیت اور جمعیت کو برقرار رکھنے کے درپے رہتا ہے۔ جس طرح دنیا مطلوب بن جائے تو اللہ سے تعلق قائم نہیں رہ سکتا، اسی طرح اگر آدمی اپنی محبت و تعظیم میں مبتلا ہو جائے تو بھی یہ تعلق کوئی صورت نہیں پکڑ سکتا۔ بندے اور معبود کے درمیان اصولی حجابات یہی دو ہیں: دنیا اور نفس۔ متکبر آدمی حبّ نفس میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے مضمرات اور نتائج وہی ہوتے ہیں جو ہم حبّ دنیا کے بیان میں دیکھ آئے ہیں۔ ماسوا اللہ کی محبت جو بندگی کی بنیاد کے انہدام کا سب سے بڑا سبب ہے، حبّ دنیا اور حبّ نفس اس کے دو بنیادی اجزاء ہیں۔ توکل غور فرمائیں تو ماسوائیت کا انکار ہی تو ہے۔

ریا

توکل ایک جہت سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی کو مطلوب بنانے کا مظاہرہ ہے جب کہ ریا اس جہت کو مسخ اور معدوم کر دیتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی کی طلب کا رخ اگر مخلوق کی پسندیدگی کی طرف ہو جائے تو یہ ریا ہے۔ ریا بظاہر اخلاص کی ضد ہے، بظاہر ہی کیا بباطن بھی۔ توکل کے ساتھ اس کا تصادم اسی بنیاد پر ہوتا ہے کیونکہ جو چیز اخلاص یعنی اصل بندگی کے منافی ہوگی دیگر فضائل بندگی سے بھی لازماً متصادم ہوگی۔ غور سے دیکھیں تو توکل اللہ کی وحدانیت کے اقرار کی ایک خاص صورت ہے جو دیگر فضائل بندگی

کی طرح اپنی مخصوص حالت اور فضیلت رکھتی ہے۔متوکل آدمی اپنی پوری قوت سے گویا یہ اعلان کررہا ہوتا ہے کہ میرا حامی وکارساز اور میرا مالک ومشکل کشا بس اللہ ہے جس پر بھروسہ کرنا اور جسے راضی رکھنے کی کوشش کرنا میرا واحد مقصود ہے۔فائدہ ہو یا نقصان، خطرہ ہو یا عافیت اس عہد کے پیچھے جو یقین، استقامت اور قوت درکار ہے ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ریا بندگی کے اس اصلی مؤقف کی تردید کا نام ہے اسی لئے اس کو حدیث میں شرک اصغر کہا گیا ہے۔

اسی طرح توکل میں بندہ اپنی خواہشات وغیرہ کی نفی کردیتا ہے اور اللہ کی مرضی پر راضی رہنے کا حل اس کے اندر سے کبھی غائب نہیں ہوتا۔ریا اس کے برعکس اپنی خواہشات کی پیروی کا نام ہے اور جو اجر صرف خالق سے مطلوب ہونا چاہئے ریاکار شخص اسے مخلوق سے طلب کرتا ہے۔مختصر یہ کہ توکل اللہ سے جڑے رہنے کا نام ہے تو ریا اس سے منقطع ہوجانے کا عمل ہے جو نیت کو بھی اس حد تک مسخ کردیتا ہے کہ اخلاص وغیرہ کا دھندلا سا تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ریا سے مکمل چھٹکارا پائے بغیر دوسرے فضائل کی طرح توکل کا حصول بھی ناممکن ہے۔

طولِ امل

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو توکل کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ آدمی لاطائل خواہشات لمبے اور چوڑے منصوبوں میں نہیں پڑتا۔اللہ پر مکمل بھروسہ مستقبل کے عنوان سے صرف آخرت کو دیکھنے پر مائل رکھتا ہے۔جو لوگ دنیاوی زندگی کے بارے میں ہمہ وقت خیالی پلاؤ بنانے کے عادی ہوجاتے ہیں ان میں سے جو چیز سب سے پہلے رخصت ہوتی ہے وہ توکل ہے۔بندہ جب اپنے سارے معاملات اللہ پر چھوڑ دیتا ہے تو اس کے ذہن، طبیعت اور ارادے کا رخ دنیا اور دنیا کی زندگی تک محدود نہیں رہتا اور اس صورت میں اس کی ذہنی فضا، ارادی قوت اور طبعی میلان آخرت کو حقیقی سمجھنے کی طرف ہوجاتا ہے۔وہ مزاج جس کی رو سے دنیا عارضی اور آخرت حقیقی ہے طول امل کو کسی بھی طرح قبول نہیں کرسکتا اور خاص طور پر ایسا آدمی جس نے اپنی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں دے رکھی ہے یعنی توکل کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، طول امل کے نزدیک بھی نہیں جاسکتا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ توکل کا مطلب ترک دنیا یا ترک سعی وعمل نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیاوی زندگی یہاں کارفرما خدائی قانون کی پوری پاسداری کرتے ہوئے اس طرح گزاری جائے کہ مقصود آخرت کی فلاح اور اللہ کی خوشنودی رہے۔جو چیز اس بنیادی پروگرام کو بری طرح متاثر کرتی ہے وہ طول امل ہے، یہ خرابی اگر جڑ پکڑ جائے یعنی ذہن ہمہ وقت دنیا میں مشغول رہے تو لامحالہ آخرت کا تصور

مٹنے لگتا ہے بلکہ اپنی بندگی کا شعور اور احساس بھی کمزور پڑنے لگتا ہے۔

تبصرۂ کتب مدیر

فرقہ وارایت اور انتہا پسندی کے رجحانات

(تاریخ، اسباب اور ان کا حل)

از پرویز عبدالخالق سہریانی بلوچ

پروفیسر بلوچ صاحب اگرچہ اپنی ان تعمیری سرگرمیوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں جن میں وہ ''ایوان علم وادب'' کے پلیٹ فارم سے اردو ادب کو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور اس کے لیے وقتاً فوقتاً پاکستان کے مختلف شہروں میں تقاریب منعقد کرتے رہتے ہیں۔ سندھ کے ایک مقابلتاً دور افتادہ علاقے (کندھ کوٹ، ضلع جیکب آباد) میں بیٹھ کر لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں اسلامی، ادبی، تعمیری سرگرمیاں جاری رکھنا بھی کرامت سے کم نہیں کہ اب ان کی کتاب ''فرقہ وارایت اور انتہا پسندی کے رجحانات'' دیکھ کر حقیقی خوشی ہوئی کہ ابھی ملت کا درد رکھنے والے اور قوم خصوصاً علماء کرام کو توجہ دلانے والے ایسے اصحاب وفکر ونظر موجود ہیں جو ملت کے افتراق وانتشار اور فرقہ وارایت پر کڑھتے ہیں اور امت کے اتحاد کے لیے جو بن پڑے کر گزرنے کو تیار ہیں۔

پروفیسر بلوچ صاحب نے اپنی اس کتاب کو ابواب وفصول میں تقسیم کرنے کی بجائے اس میں چالیس مباحث پر گفتگو کی ہے جن میں سے ایک سے بڑھ کر ایک جاذب نظر ہے اور قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے جیسے 'ائمہ کرام کے اختلافات دین میں تنگی کو روکنے اور سہولت ووسعت پیدا کرنے کا سبب ہیں'، 'متاخرین علماء میں اختلافات کی شدت اور اس کی نوعیت'، 'اختلاف رائے باعث عداوت نہیں ہونا چاہیے'، 'فرقہ وارایت کے اندرونی وبیرونی عوامل'، 'فرقہ وارایت کے نقصانات کا جائزہ'، 'اختلافات اور فرقہ واریت سے بچنے کے لیے اہم تجاویز' وغیرہ۔ کاش فرقہ پرست لوگ مصنف کے درددل کو سمجھ لیں اور ان کی تجاویز پر عمل کریں تو آج کے ماحول کی کڑواہٹ مٹھاس میں بدل سکتی ہے۔

۱۸۰ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۲۰۰/- روپے ہے اور یہ ملک کے معروف تاجران اسلامی کتب کے علاوہ ایوان علم وادب پاکستان، کندھ کوٹ ضلع جیکب آباد (سندھ) سے مل سکتی ہے۔

☆☆☆

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم و تربیت	صفحات	قیمت
۱۔ **ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث** (دوسرا ایڈیشن)	۵۴۰	۲۵۰
روپے		
اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشاۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ		
۲۔ **ہمارا دینی نظام تعلیم** ☆	۳۱۴	۳۵۰
دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب		
۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی**	۱۵۳	۸۰
اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جاسکتی ہے؟		
۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆	۲۳۱	۲۶۰
پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے، دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی		
۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆	۴۲	۴۷
۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم)	۲۴۰	۱۹۰
ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے		
۷۔ **بروشرز**		
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام	۱۲	
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟	۱۶	
۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات	۱۲	۵۰

۴۔ دینی مدارس کے نام۔ایک اہم پیغام	۱۲	
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام	زیرطبع	
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام	زیرطبع	

تربیت وتزکیہ

۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔مسلم ادارے اور تجربات۔مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ایک علمی،فکری اور تحقیقی تجزیہ	۹۰۴	۶۰۰
۲۔ **ترکِ رذائل** بُرے اخلاق،ان کے اسباب،نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے	۲۹۲	۱۹۰
۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس** (سوالاً جواباً)☆ مختصر،سادہ،عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت	۵۵	۵۲
۴۔ **حقیقتِ تصوف**	۸	۵

قرآن وسنت

۱۔ **سورہ یٰسین** دو رنگوں میں،بیک وقت تین تراجم (لفظی،بامحاورہ اور تفسیری) مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے	زیرطبع	
۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)** ۱,۰۰۰ حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ	۱۴۵۴	
۳۔ **Noble Quran, Part 1**☆ قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ	۷۰	۶۰
۴۔ **Noble Quran, Part 2-9**☆ پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ	۸۳۸	۹۳۸

فقہ وقانون

۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون☆	۲۷۳	۳۰۰
۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan**	۲۵۸	۲۰۰

پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی
جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ

۳۔ **السلطة التشریعیة۔ دراسة مقارنة (عربی)** ☆　　۱۶۹　　۱۹۵

اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ

مسلم امہ

۱۔ **مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل**　　۴۰۷　　۲۵۰

اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں
اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل

۲۔ **اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ** (دوسرا ایڈیشن)　　زیر طبع

۳۔ **جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات**　　۱۳۰　　۱۰۰

۴۔ **مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ**　　۱۲　　۸

سیاسیاتِ اسلام

۱۔ **اسلام اور پاکستان** ☆　　۱۲۷　　۱۵۵

پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار

۲۔ **اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی** ☆　　۱۳۳　　۱۴۰

۳۔ **سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت** ☆　　۴۵　　۵۰

۴۔ **اسلام اور جدید سیاسی مسائل**　　زیر طبع

اسلام (متفرق)

۱۔ **رزم حق وباطل** ☆

ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ
جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی　　۱۱۸　　۱۳۰

۲۔ **مقالاتِ امین (دو جلدیں)** ☆　　۱۲۵۸　　۱۳۵۰

ان مضامین ومقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد واخبارات میں چھپتے رہے

۳۔ **عصر حاضر میں تعبیر دین**　　زیر طبع

۴۔ **ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت**　　زیر طبع